مؤسس: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مئی ۲۰۰۸

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ
ترجمان القرآن

جلد ۱۳۵، عدد ۵، جمادی الاول ۱۴۲۹ھ، مئی ۲۰۰۸ء

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر
مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰
فون: ۰۴۲-۵۴۲۵۳۵۶
فیکس: ۰۴۲-۵۴۳۲۱۹۴
ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور
۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور - ۵۴۶۰۰
فون: ۷۵۸۶۹۱۶، ۷۵۶۵۷۶۵، ۷۰۶۵۷۶۵-۰۴۲
فیکس: ۰۴۲-۷۵۸۵۵۹۰
موبائل: ۰۳۰۷-۴۱۱۲۷۰۰
ای میل: tarjumanq@wol.net.pk
tarjuman@tarjumanulquran.org
ویب: www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے
زرسالانہ: ۳۰۰ روپے
۵ سال کے لیے: ۱۲۰۰ روپے
معاون خصوصی: ۵۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش، بھارت ۹۰۰ روپے
ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۲۰۰ روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۵۰۰ روپے

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن
A/c # 010-1957-3
UBL, Lahore Ichhra Br. Code: 0559
زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ
محکمہ تعلیم سے منظور شدہ بحوالہ SO(A-IV)4-45/99

تہذیب کا فرق

اسلامی حکومت میں عورت کو محض گڑیا بنا کر نہیں رکھا جائے گا جیسا کہ بعض نادانوں کا گمان ہے، بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ترقی کا موقع دیا جائے گا۔ ہم عورت کو عورت ہی رکھ کر عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں، اسے مرد بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں فرق یہی ہے کہ مغربی تہذیب عورت کو اس وقت تک کوئی عزت اور کسی قسم کے حقوق نہیں دیتی جب تک کہ وہ ایک مصنوعی مرد بن کر مردوں کی ذمہ داریاں اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ مگر ہماری تہذیب عورت کو ساری عزتیں اور تمام حقوق عورت ہی رکھ کر دیتی ہے، اور تمدن کی انھی ذمہ داریوں کا بار اس پر ڈالتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہیں۔ اس معاملے میں ہم اپنی تہذیب کو موجودہ مغربی تہذیب سے بدرجہا زیادہ افضل اور اشرف سمجھتے ہیں اور نہایت مضبوط دلائل کی بنا پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ہی تہذیب کے اصول صحیح اور معقول ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ صحیح اور پاکیزہ چیز کو چھوڑ کر ہم غلط اور گندی چیز کو قبول کریں۔

موجودہ زمانے کی مخلوط سوسائٹی سے ہمارا اختلاف کسی تعصب یا اندھی مخالفت کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ اپنی، آپ کی، اور پوری انسانیت اور انسانی تہذیب وتمدن کی فلاح اسی میں دیکھتے ہیں کہ اس تباہ کن طرزِ معاشرت سے اجتناب کیا جائے۔ ہمیں صرف عقلی دلائل ہی سے اس کے غلط ہونے کا یقین نہیں ہے، بلکہ تجربے سے اس کے جو نتائج ظاہر ہو چکے ہیں، اور دنیا کی دوسری قوموں کے اخلاق وتمدن پر اس کے جو اثرات مرتب ہو چکے ہیں، ان کو ہم جانتے ہیں۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ہماری قوم اس تباہی کے گڑھے میں گرے جس کی طرف ہمارے فرنگیت زدہ اُونچے طبقے اسے دھکیلنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اخلاق کھو چکے ہیں، اور اب ساری قوم کے اخلاق برباد کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری کوشش یہ ہے کہ ہماری قوم اور ہمارا ملک جو کچھ بھی ترقی کرے، اسلامی اخلاق کے دائرے میں رہ کر کرے۔ ('اسلام اور اس کے تقاضے'، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۳۱، عدد ۳، رمضان ۱۳۶۷ھ، جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۲۸-۲۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

۲۰۰۸ء ـــــ دعوت کا سال☆!

سید منور حسن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ملت اسلامیہ کو درپیش جن حالات میں غلبۂ دین کی تحریک کا نقشۂ کار پیش کیا اور عملاً اس تحریک کو برپا کیا، اس دور کی دو خصوصیات خصوصی اہمیّت کی حامل ہیں ـــــ اول یہ کہ یہ نظاموں کی کش مکش کا دور تھا۔ ایک طرف مغرب کی لبرل تہذیب اور اس کا سرمایہ دارانہ نظام تھا جو اژدھے کی طرح پوری دنیا کو نگل رہا تھا اور اس نظام کی چکا چوند نے پورے عالم کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف مشرق سے ابھرنے والا کمیونزم اور سوشلزم کا نظام تھا جو غربت کو ختم کرنے، انسانی مساوات قائم کرنے اور سرمایہ داری کے چنگل سے لوگوں کو نجات دلانے کے خوش کن اور پُرکشش نعروں اور فلسفے پر مبنی تھا لیکن یہ دراصل انسانوں کے لیے آمریت کا ایک شکنجہ تھا۔

ان دونوں نظاموں کے درمیان فکری اور نظریاتی سطح پر، اور فلسفے اور سلوگن کی سطح پر ایک آویزش تھی، لیکن عملاً خود مغربی دنیا کی بعض اکائیاں بھی سوشلزم کی کسی نہ کسی شکل کی دلدادہ بن گئی تھیں۔ مزدور اور کسان، طالب علم اور جوان، دانش ور اور اہل قلم اور صحافی، نیز مظلوم و محروم طبقات

☆ جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ۲۰۰۸ء کو دعوت کا سال قرار دیا ہے اور اس کے لیے ایک جامع منصوبہ اور لائحہ عمل بھی مرتب کیا ہے۔ پوری جماعت اس منصوبے کے مطابق اپنی سرگرمیاں ترتیب دے رہی ہے، اسی مناسبت سے اس ماہ کے اشارات میں محترم قیم جماعت نے منصوبے کے اصل مقاصد و اہداف اور ان احوال و مسائل پر کلام کیا ہے جو آج ملک اور تحریک کو درپیش ہیں۔ (مدیر)

کے دبے اور پسے ہوئے افراد ذہناً اشتراکیت کے اسیر ہو چکے تھے اور مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشروں میں رہنے کے باوجود سوشلزم کا راگ الاپتے اور اسی کی مالا جپتے تھے۔

اس پس منظر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کو ایک مکمل اور مبنی برحق اور منصفانہ نظام کی حیثیت سے ازسرنو پیش کیا، جو ایک طرف فرد کی سطح پر اس کو آسودگی، سکون اور سکینت فراہم کرتا ہے، اسے انشراح صدر کی دولت سے مالا مال کرتا ہے اور ذہنی اور فکری کجی کو ہر وسوسے اور شک سے پاک کرتا ہے۔ دوسری طرف افراد پر مشتمل معاشرے کو اپنے اداراتی نظام سے امن وسکون اور عدل و انصاف کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے، ضروریات زندگی بھی فراہم کرتا ہے اور بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب سے جوڑ کر انسانی مساوات، آزادی، اخوت اور انصاف پر مبنی نظام قائم کرتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے کیپٹلزم، نیشنل ازم، کمیونزم اور سوشلزم کی خرابیوں اور کمزوریوں کو بھی بے نقاب کیا۔ ان کے نعروں اور دعوؤں کو کھوکھلا اور بے وقعت ثابت کیا اور انسانی ضروریات کو انسانوں کے رب، وحیِ الٰہی اور نبوت کی کرشمہ سازیوں سے بھی متعارف کرایا۔ اس لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نظری طور پر تمام نظاموں کے مقابلے میں اسلام بحیثیت نظام زندگی کے قابل قبول، قابل عمل اور ایک ایمانی اور اخلاقی پیکج کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس دور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ عقلیت (rationalism) کا دور تھا جو چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرتا، یا رد کرتا ہے۔ اس دور کا یہ دعویٰ تھا کہ عقل ہی معراج انسانیت ہے اور اسی کو زندگی کے تمام دائروں میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی تعلیمات، اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کے حوالے سے جس بحث کو چھیڑا اس نے عقل کو بھی دنگ کر دیا اور اسلام بحیثیت نظام کے عقل اور استدلال، فلسفہ اور نظریہ اور انسانی ذہن میں اٹھنے والے سارے سوالات و اعتراضات کا مسکت جواب فراہم کرتا چلا گیا۔ اس طرح سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس دور کے انسان کو عقلی طور پر بھی اپیل کیا اور قرآن وسنت کی تعلیم میں جو فطری کشش اور جذب وانجذاب کی خوبیاں ہیں، ان سے بھی متاثر کیا۔ مولانا مودودیؒ کی اس تحریک نے بالآخر جماعت اسلامی کا روپ دھارا اور اب اسے قائم ہوئے ۷۰ سال ہونے کو

آئے ہیں۔ وقت بدلا ہے، حالات بدلے ہیں، کمیونزم اپنی جولانیاں دکھا کر اور چار دانگ عالم میں اپنا چرچا کر کے اور بظاہر ایک عالم کو اپنے حق میں استوار اور متحیر کر کے ہواؤں میں تحلیل اور فضاؤں میں گم ہو چکا ہے، اس کی ریاست منتشر ہو چکی ہے، اس کا فلسفہ بکھر چکا ہے اور اس کا نظریاتی تار و پود ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا، اور وہ جو بیچتے تھے ۷۰ سال سے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا چکے ہیں۔

اس عرصے میں دنیا نے نیشنلزم کے حوالے سے بھی ان گنت تجربات کیے مگر منہ کی کھائی، خود اپنے پیر پر کلہاڑی ماری، اور پوری کی پوری انسانیت کو آگ اور خون کے دریا سے گزارا، اور اب نیشنلزم میں وہ اپیل ہے نہ جاذبیت اور کشش، اور ایک نظام زندگی کی حیثیت سے ہرچند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے والی صورت سے دوچار ہے۔ مغرب کا تہذیبی اور سرمایہ دارانہ نظام، بلندیوں اور عروج کی ان گنت منازل سے گزرنے کے بعد اب کسی حقیقی پیغام اور مستقبل کی رفعتوں اور اُمنگوں سے عاری ہونے کا اعتراف کر رہا ہے۔ اس نظام اور تہذیب کا امام امریکا اپنی اور اپنے اتحادیوں کی اور ناٹو کی فوجوں سے انسانیت پر حملہ آور ہے۔ ڈیزی کٹر اور کلسٹر بموں کی بارش ہے۔ انسانوں کی تباہی کا ہر عنوان دور تک سجا ہوا ہے لیکن اس نظام کے پاس انسانیت کے لیے ظلم اور بربادی کے علاوہ کوئی پیغام نہیں۔

گذشتہ کم و بیش آٹھ عشروں میں دنیا بھر میں متعدد اسلامی تحریکیں اُٹھی ہیں۔ رجوع الی اللہ کے عنوان سے اٹھی ہیں، بندوں کو بندوں کے رب کی طرف لے جانے کے پیغام کے ساتھ اٹھی ہیں، ففروا الی اللّٰہ کا مصداق بننے والوں کی تحریکیں اُٹھی ہیں، اور دنیا بھر میں امریکی استعمار اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے مظالم کے مقابلے میں دعوت، جدوجہد اور قربانی کے کلچر نے فروغ پایا ہے۔ تاریخ کے لمحۂ موجود میں ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

مصطفویؐ تہذیب اور مصطفویؐ کارواں منزل سے قریب تر ہو رہا ہے اور تمام شیطانی اور طاغوتی قوتیں مکمل شکست اور ہزیمت سے دوچار ہوا چاہتی ہیں۔

جماعت اسلامی کو اپنی ہم عصر تحریکوں میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پہلے دن سے تنظیم جماعت کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دی۔ مولانا مودودیؒ نے ابتدا ہی میں یہ بات بار بار دہرائی تھی کہ بدی ہر دائرے کے اندر منظم ہے، جب کہ نیکی منتشر، اکیلی اور تنہا ہے لہٰذا نیکی اور بدی کے مقابلے میں ناگزیر ہے کہ نیکی اور خیر کی تمام قوتوں کو بھی منظم کیا جائے۔ انھیں پلیٹ فارم فراہم کیا جائے اور ایک سوچی سمجھی حکمت عملی سے آراستہ وپیراستہ کر کے ایک لمبی اور صبر آزما جنگ کے لیے انھیں تیار کیا جائے۔ اہداف اور مقاصد کو کھول کر بیان کیا جائے۔ منزل کا شعور اور نشاناتِ منزل سے آگاہ کیا جائے اور قرآن وسنت کی تعلیم کو لے کر اٹھنے اور دنیا پر چھا جانے کا نقشہ اور فلسفہ دو اور دو چار کی طرح ذہنوں میں اتارا جائے۔

جماعت اسلامی نے روز اول ہی سے جہاں کرنے کے کام متعین کیے تھے، وہیں انھیں ایک منصوبے، پروگرام اور نظام الاوقات کا آہنگ بھی دیا۔ ۲۰۰۸ء کو مرکزی مجلس شوریٰ نے دعوت کا سال قرار دیا ہے۔ شوریٰ کا اصل ہدف یہ ہے کہ کارکن کو رابطہ عوام کی طرف خصوصیت سے متوجہ کیا جائے۔ دعوت الی اللہ کی طرف لوگوں کو بلانا، فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، ان کی ضروریات اور مسائل سے ہم آہنگ ہو کر بھی اور اس سے ماورا آخرت کی جواب دہی، اللہ کی رضا اور حصول جنت کے لیے بھی۔

جماعت اسلامی ایمان کی تازگی، ذہنوں کی آبیاری، قلب ونظر کی تبدیلی، سوچ وفکر اور زاویۂ نگاہ کی پاکیزگی کو انقلاب اور اسلامی نظام کے برپا ہونے کا پہلا قدم سمجھتی ہے۔ جس معاشرے میں تعلّق باللہ کی وافر مقدار موجود نہ ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلّق خاطر اور عشق میں ڈوبا ہوا اتباع اور پیروی کا جذبہ مفقود ہو، اس معاشرے میں اٹھنے والی انقلاب کی لہریں کسی پاکیزہ، بابرکت اور پایدار اسلامی انقلاب کی دستک ثابت نہیں ہوتیں۔ اس اعتبار سے جماعت کی پوری تنظیم کے لیے ناگزیر ہے کہ دعوتی مہمات کو شیڈول کے مطابق مرتب کیا جائے، ضلعوں کی سطح پر یہ مہمات چلیں، عوامی رابطے اور ممبر سازی کا کام کریں، صوبائی نظم ان کی نگرانی کریں، صوبے کی سطح پر بننے والی دعوتی کمیٹیاں، دعوتی مہمات کے لٹریچر اور سرگرمیوں کو قریب سے دیکھیں اور پوری جماعت اس مہم کو اوڑھنا بچھونا بنائے، دعوت کو اپنے لیے اول وآخر قرار دنے اور

اس کے نتیجے میں لاکھوں بندگانِ خدا تک پہنچے، انھیں اپنا ہم نوا بنائے اور اسلامی نظام کو برپا کر کے معاشرے کے اندر ظلم کی جتنی شکلیں، مہنگائی، بے روزگاری، لاقانونیت، بدامنی، فحاشی اور عریانی کی صورت میں موجود ہیں، ان سب سے نجات دلائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ بنیادی طور پر خدا کا خوف رکھنے والا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈوبا ہوا اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے معمور معاشرہ ہے۔ حالات کے جبر اور ظلم و استحصال کی ان گنت شکلوں نے ان ایمانی اور اخلاقی احساسات کو جابجا مضمحل کیا ہے، انھیں ضعف پہنچایا ہے اور معاشرے پر غفلت کی ایک چادر تان دی ہے۔ دعوت الی اللہ، یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا، بندگی کی جوت جگانا، دامنِ مصطفیؐ میں پناہ لینا اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اپنانا، ان کی شریعت مطہرہ کو لے کر اٹھنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو جدوجہد اور کش مکش ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، انھیں اس کا خوگر بنانا، اس دعوتی مہم کا مقصود ہے۔

جماعت اسلامی کے کارکن کو اپنے ہم نواؤں اور ساتھیوں سے مل کر معاشرے میں بسنے والے تمام انسانوں تک خیرخواہی اور اپنائیت کا یہ پیغام پہنچانا چاہیے کہ پاکستان کی بھلائی بھی اس دعوت اور نظریے کے ساتھ مربوط ہے اور خود پاکستان کا وجود بھی اسلام اور نظریۂ پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ کارکن، ناظم اور ہر سطح کے ذمہ دارانِ جماعت دعوت الی اللہ کو اگر موضوعِ گفتگو بنائیں گے اور اس کے لیے مولانا مودودیؒ کی تحریروں اور آج کے اسلامی اور تحریکی لٹریچر سے استفادہ کریں گے تو معاشرے کی فضا بدل سکتی ہے، اس کا رخ تبدیل کیا جاسکتا ہے اور سوچ اور فکر کے تمام دھاروں کو اسلامی انقلاب اور تبدیلی کے عنوانات سے سجایا جاسکتا ہے۔

ہم جس تبدیلی کے خواہاں ہیں اس کی جڑ اور بنیاد دعوت الی اللہ ہے۔ ذہن و فکر کی تبدیلی کے بغیر جسم و جاں کا قبلہ و کعبہ درست نہیں کیا جاسکتا۔ پایدار اور دیرپا انقلاب اس بات کا متقاضی ہے کہ دلوں پر دستک دی جائے، ذہنوں کو جھنجھوڑا جائے، کچھ کرنے اور کر گزرنے کے لیے آمادگی پیدا کی جائے، ایثار و قربانی کی شمع فروزاں کی جائے اور ایک بدلے ہوئے انسان کو دریافت کیا جائے۔ یہ کام قرآن و سنت کی دعوت ہی سے ممکن ہے۔ انسانی فطرت کو اپیل کرنے والا پیغام ہی دلوں کی دنیا کو بدل سکتا ہے، ان میں انقلاب برپا کرسکتا ہے۔

۲۰۰۸ء کا منصوبہ، تحریک سے وابستہ ہر فرد کو متحرک کرنے کا منصوبہ ہے اور یہ منصوبہ دعوت کی ہمہ گیریت، تربیت اور تزکیے کے بھی تمام اہداف اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ منصوبے نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ فکری اور نظری اعتبار سے دعوتی جدوجہد کو تقویت پہنچانے کے لیے جماعت کے تمام تحقیقی و اشاعتی اداروں کو بھی ٹاسک دیا جائے۔ یہ ادارے مختصر کتابچوں کی تیاری، دو ورقوں اور ہینڈ بلوں کی اشاعت اور ان کی مسلسل فراہمی کی منصوبہ بندی کریں اور اس لٹریچر کو مناسب قیمت پر فراہم کرنے کا اہتمام کریں۔

یوم نظریۂ پاکستان ۱۴ راگست، یوم تاسیس جماعت ۲۶ راگست، یوم اقبال ۹ نومبر، یوم یک جہتی کشمیر ۵ فروری اور ان سب کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر افطار پارٹیاں، شب بیداریاں اور عیدملن کے اجتماعات منعقد کیے جائیں، ان سب پروگراموں کی اصل اکائی ضلعی جماعتیں ہیں۔ ضلعی نظم ہی ان پروگراموں کی تفصیلات طے کرے اور ہر یونٹ کو مؤثر بنانے کی تدابیر سوچے اور اختیار کرے۔ اسی دعوت بالقرآن کا موضوع رفتہ رفتہ کارکنوں سے اتر کر عوام میں سرایت کر جائے۔ پورے ملک میں سیکڑوں مقامات پر لاکھوں افراد نے فہم دین اور دعوت بالقرآن کے اجتماعات کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور مرد و خواتین کی بہت بڑی تعداد کو ان پروگرامات میں دل چسپی لیتے اور ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

کا مصداق اور عملی نمونہ بنتے دیکھا ہے۔ ایسے تمام اجتماعات میں حدیث نبویؐ اور اسوۂ صحابہؓ پر تعلیمی نوعیت کے نصاب ترتیب دے کر پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ فہم دین اور اسلام کا حقیقی انقلابی تصور اجاگر ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موثر افراد، کلیدی شخصیات، سربرآوردہ لوگ اور رائے عامہ پر اثرانداز ہونے والوں سے خصوصی رابطے، انھیں لٹریچر کی فراہمی، ان کے ساتھ الگ نشستوں کا اہتمام دعوت کے فروغ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔ برادر تنظیمات ہمارے دست و بازو ہیں۔ جہاں جہاں نظم جماعت ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، ان کی سرپرستی کرتا اور ان کی ضروریات فراہم کرتا ہے، وہاں یہ برادر تنظیمات اپنی کارکردگی کے جوہر بکھیرتی ہیں، اپنی صلاحیت کا لوہا منواتی ہیں اور دعوت کے فروغ میں جماعت کے ہم رکاب نظر آتی ہیں۔

گذشتہ کئی برسوں سے منصوبۂ عمل میں لائبریری کے قیام اور فروغ پر زور دیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ لائبریری کے کردار کو توسیع دی جائے۔ ان کو اور زیادہ مؤثر بنایا جائے۔ کتب اور رسائل کے ساتھ ساتھ دینی، علمی اور دعوتی سی ڈیز بھی فراہم کی جائیں۔ ہر ضلعی صدر مقام پر اور جس مقام پر بھی ممکن ہو ایک ماڈل لائبریری قائم کی جائے جہاں بیٹھ کر پڑھنے کی جگہ بھی اور رسائل و جرائد بھی باقاعدگی سے آتے ہوں، اور حسن انتظام لوگوں کو متوجہ کرے تو امید ہے کہ علاقے کے ممتاز افراد اور علم دوست شخصیات، نیز طلبہ اور نوجوانوں کی بڑی تعداد ان لائبریریوں سے استفادہ کر سکے گی۔

بچوں اور نوجوانوں کا تناسب پاکستان کی آبادی میں نصف سے زائد ہے۔ مستقبل کا کوئی پروگرام اور کوئی منصوبہ بندی اس حقیقت کو نظر انداز کر کے ترتیب نہیں دی جاسکتی۔ صوبائی سطح پر نوجوانوں میں کام کے لیے خصوصی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ انھیں دین سے وابستہ کرنے کی شعوری کوشش درکار ہے۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافے کے لیے تربیتی ورکشاپوں کا اہتمام ضروری ہے، اور ان کی مجموعی قوت کو تنظیم کی مضبوطی کے لیے استعمال کرنے کا نقشۂ کار بنانا ضروری ہے۔

نوجوانوں میں تحرک اور سرگرمی پیدا کرنے اور انھیں بے مقصدیت کے اندھیروں سے نکال کر بامقصد زندگی کی طرف لانے کے لیے نظم جماعت کو زیادہ سنجیدہ کوششیں کرنی چاہییں۔ ایک طرف نوجوانوں کی سوچ و فکر، ان کے مسائل اور ضروریات اور معاشرے کی بے راہروی کا احاطہ کرنا ہوگا، تو دوسری طرف مثبت اور تعمیری سرگرمیوں کا ایسا جال بچھانا ہوگا جو معاشرے پر اثرانداز ہو سکے اور نوجوانوں کی سیماب صفت شخصیت کو کردار کے سانچے میں ڈھال سکے۔ ہمیں اس سوال کا بھی سامنا کرنا چاہیے کہ نوجوانوں میں کام کے نتیجے میں بالآخر جماعت اسلامی کی عددی قوت میں بھی اضافہ ہو اور وقت گزرنے کے ساتھ نظریاتی کارکن اور پتّا ماری سے کام کرنے والے، نیز مکمل سپردگی اور کامل حوالگی کا نمونہ بننے والے جماعت کی صفوں میں ذمہ داریوں کے مناصب پر اور نظام اسلامی کی جدوجہد میں پیش پیش نظر آئیں۔

رابطہ عوام کی دعوتی مہم کا لازمی تقاضا ممبر سازی ہے۔ اب سے کچھ پہلے کم و بیش ۵۰ لاکھ

پاکستانیوں نے ممبرسازی کے گوشوارے پُر کیے تھے اور جماعت اسلامی کے مقصد اور کام سے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر سطح کا نظمِ جماعت ممبرسازی کے بعد کے تقاضوں کو تنظیمی سانچے میں ڈھالے۔ ممبر حضرات سے رابطے، جماعت کی پالیسیوں سے انھیں باخبر رکھنے، مختلف سرگرمیوں میں انھیں شریک کرنے اور ان کی قوت کو جماعت کے حق میں استوار کرنے کی منصوبہ بندی، دو اور دو چار کی طرح کی جانی چاہیے۔ صوبائی جماعتیں اور ان کی صوبائی نگران کمیٹیاں ضلعی سطحوں پر اس کام کی نگرانی کریں تو فی الحقیقت معاشرے میں دعوت الی اللہ کا چلن عام ہوسکے گا اور ان گنت برائیوں کے سدّباب کے لیے اور منکرات کے استیصال کے لیے ممبر حضرات سے بڑا کام لیا جاسکے گا۔

میں یہ یاد دلاتا چلوں کہ اب سے ۳۰، ۳۵ سال پہلے تک مرکزی مجلس شوریٰ اپنے سالانہ اجلاس میں جو منصوبۂ عمل ترتیب دیتی تھی، اس میں جماعتوں کے ذمے کیے جانے والے کاموں کے اہداف اور اعداد و شمار بھی طے کیے جاتے تھے لیکن تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر شوریٰ میں اس رائے کو تقویت حاصل ہوئی کہ مرکزی منصوبہ محض عمومی اور اصولی طور پر کام اور اس کی جہتوں کا تعین کرے، جب کہ نظم کی نچلی سطح پر اعداد و شمار اور سال بھر میں کی جانے والی سرگرمیاں، ان کے اہداف وہی لوگ طے کریں جنھیں یہ منصوبہ لے کر چلنا ہے۔ اس لیے یہ ضروری قرار پایا کہ ہر سطح پر منصوبۂ عمل کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور کم از کم ہر سہ ماہی یہ کام ضرور کیا جائے تاکہ جائزے کے نتیجے میں مقامی سطح پر منصوبے کے اہداف میں کمی بیشی کی جاسکے۔

بطور یاد دہانی یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جماعت اسلامی عملاً ایک تحریک ہے اور ایک تنظیم بھی۔ ماحول اور معاشرے میں ہونے والے مدوجزر اور اچانک درپیش آنے والے مسائل سے نہ ہم لاتعلق رہ سکتے ہیں، اور نہ کسی 'منصوبے' کے ہی اسیر ہوکر نئے اٹھنے والے طوفان کو نظرانداز کرسکتے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی رونما ہونے والی تبدیلیاں، اسلامی تحریکوں کو پیش آنے والے واقعات اور خود اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر پروپیگنڈے کی دنیا میں اُچھالا جانے

والا کیچڑ اور اس بارے میں امت کا جو حقیقی موقف ہو سکتا ہے، اس کا احاطہ کرنا، اس پر احتجاجی لہر اٹھانا، اپنے حکمرانوں اور دنیا بھر کی دریدہ دہن قوتوں کو للکارنا، یہ سب ہمارے ایجنڈے کا حصہ ہے۔ ہمارے ایمان کا تقاضا اور ہماری تحریکیت کا امتحان ہے۔ لہٰذا سال کے مختلف حصوں میں منصوبۂ عمل کے ساتھ ساتھ ہنگامی نوعیت کی منکرات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوششیں بھی جاری رہیں گی۔

جن حالات سے اس وقت ملک گزر رہا ہے، اس میں باہم مل جل کر چلنے کی ایک عمومی فضا پیدا کرنے اور اتفاقِ رائے کی حکومت قائم کر کے ایجنڈے کے کم سے کم نکات پر عمل درآمد کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ قومی مفاہمت کے نام پر جہاں یہ ضروری ہے کہ کم سے کم قومی ایجنڈے کا تعین کر کے عوام کو اعتماد میں لیا جائے اور انھیں سنہرے مستقبل کی تعمیر کی دعوت میں شریک کیا جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ پارٹیوں کا ٹریک ریکارڈ، ان کا ماضی اور ان کے عمومی کردار کو ہرگز نظرانداز نہ کیا جائے، بصورت دیگر قومی مفاہمت کے نام پر اسے سبوتاژ کرنے اور آپ ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کا اسلوب بھی آپ سے آپ اس میں شامل ہو جائے گا۔ کسی بھی سطح پر جماعتوں کا اتحاد یا مل جل کر چلنے کا اعلان عملاً اپنے اپنے ضعف کا اعلان بھی ہوتا ہے جو کام اکیلے اور تنہا پارٹیاں اور پلیٹ فارم انجام نہ دے سکیں، ان کے لیے مل جل کر کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے اتحادوں اور مفاہمت کا ایجنڈا مختصر اور کم سے کم ہوتا ہے، جب کہ مفصل اور زیادہ سے زیادہ ایجنڈا ہر پارٹی کا اپنا منشور ہوتا ہے۔

آنے والے دنوں میں چیف جسٹس اور ان کے ۶۰ سے زائد ساتھیوں کی بحالی آزاد عدلیہ کی طرف پہلا قدم قرار پائے گا۔ اس بارے میں جتنی افواہیں اور سازشیں جنم لے رہی ہیں وہ عوام کے عزم کو شکست نہ دے سکیں گی۔ کم و بیش ۶۰ ہفتوں پر مشتمل وکلا کی تحریک، بنچ اور بار کا اتحاد، سول سوسائٹی، میڈیا اور سیاسی کارکنوں کی جدوجہد کو بے معنی اور بے مقصد بنانے اور انھیں غیراہم قرار دے کر، ان کو پٹڑی سے اتارنے کی جو کوششیں بھی اِدھر اُدھر سے کی جارہی ہیں بالآخر لوگوں کے عزمِ صمیم کے سامنے وہ دم توڑ دیں گی۔ وزیراعظم نے ابتدائی ۱۰۰ دن کے لیے جس پروگرام اور ترجیحات کا اعلان کیا ہے یقینی طور پر وہ نہایت خوش کن ہے، زخموں پہ پھایا اور دکھوں کے مداوے

کے مترادف ہے لیکن ابھی تک ان اعلانات کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی مؤثر کوشش دیکھنے کو نہیں ملی۔ صوبائی حکومتوں کو ہدایات جاری ہونی چاہییں۔ طلبہ یونینز کے بارے میں بھی، ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے حوالے سے بھی اور ایف سی آر کو ختم کرنے کے بارے میں بھی مرکزی حکومت کو ایک اچھے ہوم ورک کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی خوش آیند ہے کہ عوام نے آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی تک اپنے حقیقی معاشی مسائل کے حل کو ملتوی کر رکھا ہے۔ عوام اس بات کو رفتہ رفتہ پا گئے ہیں کہ جس معاشرے میں قانون کی فرماں روائی نہ ہو اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے نظر نہ آئیں، وہاں مہنگائی، بے روزگاری، لاقانونیت اور محرومیوں کا مداوا نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ مرکز میں بننے والی اتفاقِ رائے کی حکومت عوام کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے ایک ریلیف پیکج کا بھی فوری اعلان کرے اور یہ کام اچھی تیاری اور لائحہ عمل کی مشکلات کو عبور کر کے کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ناگزیر ہے کہ معاشیات کو جاننے والے غریب اور پسے ہوئے عوام کا درد رکھنے والے اور بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی مایوسی اور ناامیدی کو شکست دینے کا عزم رکھنے والے مل بیٹھیں اور کم سے کم وقت میں ایک ریلیف پیکج کا اعلان کریں جس پر عمل ہوتا ہوا نظر آئے اور جو کسی نہ کسی درجے میں لوگوں کے لیے واقعی سُکھ کا باعث بن سکے۔

قبائلی علاقوں اور بلوچستان سے فوج کو واپس بلانا اب دیوار پر لکھی تحریر کے مانند ہے۔ فوج کی واپسی کے ساتھ ہی مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر مسائل حل کرنا ناگزیر ہے۔ جرگوں کا انعقاد ہونا چاہیے اور ہر جرگے کے فیصلے کو عمل کا روپ دینا چاہیے۔ امریکی ڈکٹیشن سے آزاد ہو کر اپنے مسائل اپنے ہی دائرے میں رہ کر اور اپنے ہی لوگوں کو اعتماد میں لے کر حل کیے جانے چاہییں۔ جتنے بڑے پیمانے پر بلوچستان اور صوبہ سرحد میں جانی اور مالی نقصان ہو چکا ہے، اس نے باہمی اعتماد کا بھی شدید بحران پیدا کیا ہے۔ مل بیٹھنے اور حسن نیت اور ارادے کی مضبوطی کے اظہار سے اور پھر فیصلے پر عمل درآمد سے اعتماد کے بحران کو شکست دی جاسکتی ہے اور اعتماد سازی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔

صوبہ سندھ بقیہ صوبوں کے مقابلے میں جتنے بڑے پیمانے پر دہشت گردی کا سامنا کرتا رہا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کو دہرانا ضروری ہے کہ ۱۲ ربیع الاول، نشتر پارک

کراچی میں ہونے والے علما کے قتل کی ازسرنو تحقیقات کرائی جائیں۔ ۱۲مئی ۲۰۰۷ء کو شہر کراچی میں جس طرح ۵۰ سے زائد لوگ ہلاک کیے گئے، اس پورے واقعے کی بھی تحقیقات کی جائیں۔ نیز ۱۲مئی ۲۰۰۴ء کو کراچی میں ہونے والے ضمنی انتخابات میں جس بڑے پیمانے پر دہشت گردی ہوئی اور سیاسی کارکنوں کو شہید کیا گیا، اس کا بھی نوٹس لیا جائے اور اب تازہ ترین واقعہ جو ۹ اپریل ۲۰۰۸ء کو ہوا ہے اور شہر کراچی کو آگ اور خون کے دریا میں دھکیل دیا گیا ہے، اس کی بھی مکمل تحقیقات کی جائیں۔ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ بلیک میلنگ کی سیاست کو ختم کیا جائے اور بھتہ خوری اور بوری بند لاش کلچر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ ناگزیر ہے کہ اس کام کو کرنے کے لیے سندھ کی صوبائی حکومت پرعزم ہو، مرکزی حکومت کی مکمل آشیرباد اسے حاصل ہو اور دباؤ میں آکر، بلیک میل ہو کر، خواہ یہ دباؤ عالمی اور بین الاقوامی ہو یا مقامی اور خفیہ اداروں کی طرف سے ہو، ایسے دہشت گردوں کو ہرگز ہرگز اقتدار میں شریک نہ کیا جائے جو ہزاروں جانوں کے اتلاف اور اربوں روپے کی املاک کو نقصان پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔

سیاسی جماعتوں سے اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ ان کے ساتھ مل کر بھی کوئی حکمت عملی بنائی جاسکتی ہے اور کبھی ان سے ہٹ کر بھی، لیکن ایک فسطائی گروہ کو سیاسی جماعت سمجھنے کا جو خمیازہ اہل کراچی اور سندھ نے پچھلے بیس برسوں میں بھگتا ہے، اس کی اب تلافی ہونی چاہیے۔ بہت ہو چکا۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا اور پانی سر سے بھی اونچا ہو چکا۔ عوام کی بڑی تعداد قومی اور صوبائی سطح پر بننے والی حکومتوں سے خوش گمان ہے اور حکومتی رویوں کو اعتماد بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ جو اپنے ایجنڈے اور اس کی ترجیحات کا بار بار اعلان کر رہی ہیں۔ لہٰذا سید یوسف رضا گیلانی کی حکومت کو ایک بڑا امتحان درپیش ہے۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں، لیکن وعدوں اور اعلانات کے پورا نہ ہونے اور امیدوں کے بر نہ آنے کے جو خوفناک نتائج ہو سکتے ہیں اور جتنے بڑے پیمانے پر بپھرے ہوئے لوگوں کا غیظ و غضب اپنے آپ کو منوانے کے لیے جو کچھ کرسکتا ہے، اس سے بھی بے خبر نہ رہنا چاہیے۔

موجودہ حکومت نے کشمیر کے بارے میں ابتدائی چند بیانات کچھ عجلت میں دے دیے تھے، ہمیں اپنے اصولی موقف پر قائم رہنا چاہیے۔ اہل کشمیر کی جدوجہد کو تسلیم کرنا چاہیے۔ بین الاقوامی برادری

نے ان سے جو وعدے کیے ہیں، ان کے مطابق انھیں حقِ راے دہی ملنا چاہیے اور پاکستان کو اپنی اخلاقی، سفارتی اور سیاسی تائید بڑھ چڑھ کر جاری رکھنی چاہیے۔ کشمیر ہماری شہ رگ ہے اور دشمن کے ہاتھ میں اپنی شہ رگ دے دینے والے بالآخر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس خودکشی سے قومی سطح پر بچنے کا واحد نسخہ یہی ہے کہ کشمیریوں کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ بھارت کے عزائم کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے اور اس خطے میں امریکی عمل دخل کو شکست سے دوچار کیا جائے۔

اس پورے پس منظر میں جماعت اسلامی کا کارکن بھی ایک بڑی آزمایش سے دوچار ہے۔ ۲۰۰۸ء کے منصوبۂ عمل پر اس کی روح کے ساتھ عمل بھی کرنا ہے اور چاروں طرف کے حالات سے باخبر رہ کر تحریکوں، مہمات اور عوام کی آواز بن کر بھی اٹھنا ہے۔ ہم نے ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہ کر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا ہے۔ آیندہ بھی ہمارا ہتھیار اللہ پر ایک جیتا جاگتا ایمان، اس کی قدرت کاملہ پر بھروسا اور اسی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہنے کا عزم ہے اور یہ سب کام اس کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لیے کیا جانا ہے، اور کس سے یہ بات مخفی ہے کہ اللہ تک جانے کے تمام راستے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوکر گزرتے ہیں اور سنت ثابتہ کو اپنانے سے ہموار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر کارکن کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ کمر ہمت کس لے، تعلق باللہ کی استواری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ سنت نبویؐ کو اپنائے، شریعت مطہرہ کو لے کر اٹھے اور جو جدوجہد اور کش مکش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، اس کا خوگر بنے اور اس بارے میں کسی لیت و لعل سے کام نہ لے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ہمارے حالات کو سدھارے گا، ہمیں اپنی تائید سے نوازے گا، ہماری ٹوٹی پھوٹی جدوجہد کو قبول کرے گا اور جن آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ قربانیاں دے کر اسے باقی رکھا گیا ہے، اس کو نتیجہ خیز بنائے گا اور ہم اپنے سر کی آنکھوں سے پاک سرزمین پر قرآن و سنت کا پاکیزہ نظام روبہ عمل دیکھ سکیں گے۔ ان شاءاللہ!

پاکستان میں نئی امریکی سفارت کاری

—— ایک خطرناک کھیل

پروفیسر خورشید احمد

صدر جارج بش کی حکومت خود اپنے ملک میں اور بین الاقوامی میدان میں سخت مشکلات کا شکار ہے اور کسی ایسے اقدام کے لیے بے چین ہے جس سے پے در پے شکستوں اور ہزیمتوں کے بعد کسی نوعیت کی سرخ روئی کا دعویٰ کیا جاسکے۔ عراق کی جنگ کے پانچ سال کے جتنے بھی جائزے آئے ہیں، وہ بش کی پالیسیوں کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جنگ غلط دعووں اور جھوٹ پر مبنی رپورٹوں کے سہارے سے شروع کی گئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ عراق کے پاس عمومی تباہی کے مہلک ہتھیار نہیں ہیں، ان معدوم ہتھیاروں اور ان کے مغربی دنیا کو خیالی خطرات کے نام پر فوج کشی کی گئی۔ صدام کے دور میں نہ صرف عراق میں القاعدہ کا کوئی وجود نہیں تھا، بلکہ عراق اور القاعدہ کا کسی سطح پر بھی کوئی رابطہ نہیں تھا، مگر القاعدہ کو بھی نشانہ بنانے کے لیے عراق پر حملہ کیا گیا اور عراق ہی نہیں پوری عرب دنیا میں القاعدہ کے ظہور اور سرگرمیوں کے لیے جواز فراہم کیا گیا۔ عراق کی جنگ میں ۳ ہزار سے زیادہ امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں، اس سے ۱۰ گنا زیادہ زخمی ہوئے ہیں اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب فوجی عراق کی جنگ میں کچھ کردار ادا کرنے کے باعث ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہیں جس سے پوری امریکی فوج کا ذہنی اور اخلاقی توازن درہم برہم ہے۔ مالی اعتبار سے ۶۵۰ ارب ڈالر کے بلاواسطہ مصارف کے علاوہ جو بوجھ امریکی معیشت پر پڑا ہے، اس کا اندازہ چوٹی کے امریکی معاشی ماہرین کے خیال میں ۲ ٹریلین (۲ ہزار ارب) ڈالر سے زیادہ ہے اور باقی

دنیا کی معیشت پر اس کے علاوہ کم از کم ایک ٹریلین (ایک ہزار ارب) ڈالر کا بوجھ پڑا ہے۔

اس وقت جب دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی حصّہ (۱۵ء۱ ارب افراد) غربت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے، امریکا نے صرف اپنے شوقِ جہاں بانی اور اسرائیل کو محفوظ کرنے کے لیے ہزاروں بلین ڈالر جنگ کی آگ میں جھونک دیے ہیں، اور اب عراق کی ناکامی پر پردہ ڈالنے اور توجہ کو دوسری طرف مبذول کرانے کے لیے افغانستان، ایران اور خصوصیت سے پاکستان اور اس کے شمالی علاقوں کو اپنی ترک تازیوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس سلسلے میں نئی جارحانہ محاذ آرائی روز افزوں ہے۔ اس کا آغاز گذشتہ سال ہی ہوگیا تھا اور پرویز مشرف کی کمزوریوں کا فائدہ اُٹھا کر امریکا نے شمالی علاقہ جات میں بے دردی سے بلاواسطہ کارروائیوں کا سلسلہ تیز کیا۔ ایک اندازے کے مطابق گذشتہ دو سال میں ۳۶ بار امریکی فوجی کارروائیوں کے ذریعے ہماری سرزمین کو ہماری آزادی اور حاکمیت کا مذاق اڑاتے ہوئے نشانہ بنایا گیا ہے جن میں سیکڑوں افراد بشمول معصوم بچے، بوڑھے اور خواتین شہید ہوئے ہیں۔ ان میں سے ۱۰ حملے ۳ نومبر ۲۰۰۷ء اور ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کے درمیان ہوئے ہیں جس سے پرویز مشرف اور امریکی قیادت کے گٹھ جوڑ اور آیندہ کے لیے پرویز مشرف کے کسی نہ کسی شکل میں اقتدار پر باقی رکھنے کی خواہش کے محرکات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

پاکستانی عوام کی عظیم اکثریت پرویز مشرف اور ان کی پالیسیوں سے برأت کا مسلسل اظہار کر رہی ہے۔ راے عامہ کے تمام ہی جائزے بتا رہے تھے کہ ۸۰ فی صد عوام ان سے نجات کے خواہاں ہیں اور یہی چیز ۱۸ فروری کے انتخابات میں ثابت ہوگئی۔ پرویز مشرف کی طرح امریکی قیادت بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ۲۰۰۷ء کی بدلتی ہوئی فضا کے پیش نظر اس نے ملک کی دوسری سیاسی قوتوں سے جوڑتوڑ کا آغاز کر دیا تھا، مگر یہ نقشہ آسمانی فیصلوں کے ذریعے درہم برہم ہوگیا۔ ۱۸ فروری کے بعد سے امریکا پر ایک گونہ گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہے، اور اس کی پوری مشینری، صدر بش سے لے کر اس کے مقامی سفارت کاروں تک بشمول دانش وروں اور صحافیوں کی فوج ظفر موج، نئی حکمت عملی کے لیے فضا ہموار کر کے اور نومنتخب قیادت کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے سرگرم ہیں۔ پرویز مشرف اور ان کے سیاسی حلیف ابھی تک امریکی حکمت عملی میں کلیدی

مقام رکھتے ہیں لیکن اس وقت ساری کوشش پیپلز پارٹی کی قیادت کو اپنا ہم نوا بنانے میں صرف ہورہی ہے۔ اس کے شریک چیرپرسن جناب آصف علی زرداری نئے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی اور نئے وزیرخارجہ شاہ محمود قریشی خصوصی نشانہ ہیں۔فوج کے سربراہ اور اعلیٰ قیادت بھی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

نئی حکمت عملی کے دو پہلو ہیں:

اوّلاً، پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف اپنی نام نہاد جنگ میں حسب سابق آلۂ کار بنائے رکھنے کے لیے سفارتی دباؤ اور معاشی لالچ کے تمام حربے استعمال کیے جارہے ہیں۔ مخلوط حکومت نے چونکہ محض عسکری قوت سے سیاسی مسائل کے حل کے بارے میں اپنے کچھ تحفظات کا اظہار کیا اس لیے واشنگٹن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ انتخابات کے فوراً بعد سفارت کاروں کی ایک فوج حملہ آور ہے اور پاکستان میں امریکی سفارت کار بھی سیاسی کارکنوں کی طرح متحرک ہیں۔ایک طرف پرویز مشرف کو کسی نہ کسی حیثیت سے برسرِاقتدار رکھنے اور ایم کیو ایم کو اقتدار میں شریک بنانے کی ہمہ جہتی کوشش ہے تو دوسری طرف نئی حکومت کو امریکی تائید کی لالی پوپ دینے کے لیے کونڈولیزا رائس نے کمال شفقت سے فوج کو سیاسی قیادت کے تحت کارفرما دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے (The need for Pakistan's military to be placed under civilian control) اور امریکی سینیٹرز اور سفارت کاروں نے معاشی اور فنی امداد میں تین گنا اضافے کی بات کی ہے۔کانگرس نے اگلے پانچ سال کے لیے ۷ ارب ڈالر کی امداد کے پیکیج کا دلاسہ دیا ہے۔لیکن گاجر مولی والی اس سیاست کے ساتھ ڈنڈے اور لاٹھی والی بات کا بھی بھرپور اظہار کیا جارہا ہے جو اس حکمت عملی کا دوسرا اور زیادہ خوف ناک ستون ہے۔

تمام شواہد اس امر کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ پرویز مشرف نے تمام قومی مفادات اور عزت و آبرو کو پس پشت ڈال کر محض اپنی کرسی کو بچانے کے لیے امریکا کو یہ عندیہ دے دیا تھا کہ امریکا اور ناٹو کی افواج جب چاہیں پاکستان کی سرزمین پر اقدام کرسکتے ہیں۔الیکشن کے بعد اس کھلی چھٹی کا راز فاش ہوگیا اور قوم کا مزاج بالکل سب کے سامنے ہے کہ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ نیز امریکا اور مشرف کی عسکری قوت سے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کی حکمت عملی کو بھی عوام نے صاف

طور پر رد کر دیا ہے اور نومنتخب حکومت کے سب ہی عناصر سیاسی عمل اور مذاکرات کے ذریعے معاملات کو نمٹانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ سب امریکا کے لیے ایک بڑی شکست اور بش کی خارجہ پالیسی کے لیے بڑا دھچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفارتی دباؤ اور معاشی لالچ کے ساتھ امریکا کی پوری قیادت پاکستان کو آنکھیں دکھانے اور اپنی مرضی سے پاکستان کی سرزمین پر فوج کشی کرنے کی دھمکیاں دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ نئی حکومت کو اس سفارتی دہشت گردی (diplomatic terrorism) کے ذریعے اسی طرح گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکیں جس طرح نائن الیون کے بعد اس وقت کے مطلق العنان حکمران جنرل پرویز مشرف کو کیا تھا۔

اس یلغار کا ایک اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایڈمرل مائک مولین (Mike Mullen) نے جو امریکا کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف کے عہدے پر فائز ہیں، فرمایا ہے کہ عراق میں مصروف ہونے کے باوجود ہمیں دوسرے خطرات سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں خصوصی نظر پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر رکھنا ضروری ہے جہاں سے خطرات کے پیغام پھوٹ رہے ہیں:

> اگر مجھے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا پڑے جہاں سے اگلا حملہ ہونے والا ہے تو یہ وہ جگہ ہے جسے میں یقیناً منتخب کروں گا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں القاعدہ ہے، جہاں ان کی قیادت ہے اور ہمیں اس چیلنج کو ختم کرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

اسی طرح سی آئی اے کے ڈائرکٹر مائیکل ہے ڈن (Michael Hayden) کا ارشاد ہے:

> القاعدہ قبائلی علاقے میں دوبارہ مجتمع ہوگئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ امریکا پر کسی دوسرے حملے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔

ایک اور جاسوسی ایجنسی ایف بی آئی کے ڈائرکٹر روبرٹ موئیلر (Robert Meuller) کا ارشادگرامی ہے کہ القاعدہ کے کارندے قبائلی علاقوں میں روپوش ہیں اور ''وہ راتوں رات خاموشی سے غائب نہیں ہوجائیں گے''۔

اس کورس میں جس بات کا سب سے زیادہ تذکرہ ہے، وہ یہ ہے کہ نائن الیون کے حملے کی

منصوبہ بندی عراق میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ افغانستان میں ہوئی تھی۔ پانچ سال تک عراق کو تاراج کرنے کے بعد اب یہ راگ الاپا جا رہا ہے کہ اصل خطرہ تو افغانستان اور پاکستان سے ہے اور ہم ناحق عراق میں پھنسے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن سے ایک اہم رپورٹ کے مطابق:

> گذشتہ ۱۰ دنوں میں خطرے کے نئے احساس، یعنی فاٹا میں القاعدہ قائدین کا دوسرے نائن الیون کا منصوبہ بنانے پر واشنگٹن میں درجنوں اجتماعات میں گفتگو ہو چکی ہے۔
> (ڈان، ۲۱ اپریل ۲۰۰۸)

اس بحث و مباحثے کی انتہا خود صدر جارج بش کا وہ بیان ہے جو انھوں نے اے بی سی نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے دیا ہے:

> افغانستان اور عراق نہیں، بلکہ پاکستان وہ جگہ ہے جہاں سے امریکا پر نائن الیون جیسا دوسرا حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

موصوف کا ارشاد ہے کہ:

> پاک افغان سرحد کے ساتھ قبائلی علاقے آج کل دنیا کے خطرناک ترین علاقوں میں سے ایک ہے جہاں القاعدہ نے اپنے لیے محفوظ پناہ گاہیں قائم کرلی ہیں، اور امریکا پر حملہ کرنے کے منصوبے بنارہے ہیں۔

جب اے بی سی کے نمایندے نے یہ سوال کیا کہ: If there was another 9/11 plot being hatched, it was probably hatched in Afghanistan and Pakistan and not in Iraq۔ بش کا جواب تھا: I would say not in Afghanistan, I would say in........ جس پر سوال کرنے والے نے لقمہ دیا: Pakistan? اور صدر بش نے مہرِ تصدیق لگاتے ہوئے فرمایا: Yes, probably true ـــــ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اسی وجہ سے ضروری ہے امریکا میں FISA Law جیسے قوانین موجود رہیں جس کے ذریعے ٹیلی فون ٹیپ کرنے اور ان کو ریکارڈ کرنے کا حق حکومت کی ایجنسیوں کو دیا گیا ہے۔ (ڈان، ۱۳ اپریل ۲۰۰۸ء)

یہ ساری دھمکیاں اس لیے دی جارہی ہیں کہ پاکستان کی نئی حکومت کو دھمکا کر اسی طرح

مطیع فرمان بنالیا جائے، جیسے نائن الیون کے بعد پرویز مشرف کو کیا گیا تھا اور جو عملاً امریکا کے یرغمال کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

آج پاکستان کی موجودہ قیادت کو ستمبر ۲۰۰۱ء ہی جیسے چیلنج سے سابقہ ہے، گو الفاظ اور اندازِ کار میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن اصل فرق یہ ہے کہ پاکستانی عوام پرویز مشرف کی سات سالہ ناکام پالیسی کا پورا شعور رکھتے ہیں اور ۱۸ فروری کے انتخابات میں اپنے اس عزم کا بھرپور اظہار کر چکے ہیں اور اب امریکا کے تابع مہمل بن کر امریکا کی اس لڑائی میں کرایے کے سپاہی کا کردار ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ اس ناکام پالیسی کو جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں اور عوام نئی قیادت کو جس طرح عدلیہ کی بحالی کے معاملے میں پیچھے نہیں ہٹنے دیں گے، اسی طرح امریکا کی اس جنگ میں پاکستان اور اس کی افواج کے کردار کے بارے میں بھی ماضی کی پالیسی کو کسی نئی شکل میں جاری رکھنے، اور نئی زندگی دینے کی اجازت بھی ہرگز نہیں دیں گے۔

امریکا افغانستان، عراق اور پوری دنیا میں یہ جنگ ہار چکا ہے اور محض قوت اور دولت کے سہارے اسے جاری رکھنا ممکن نہیں۔ خود امریکا کے عوام کے ۸۰ فی صد اب صدر بش کی پالیسیوں سے اختلاف کا اظہار کر رہے ہیں، اور نصف سے زیادہ صاف کہہ رہے ہیں کہ عراق اور افغانستان میں امریکا کی پالیسیاں ناکام رہی ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اس کے عوام اور دانش ور اچھی طرح جانتے ہیں کہ امریکا کی اس جنگ میں شرکت کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ یہ ہے:

۱- پاکستان اپنی آزادی، حاکمیت اور اپنی سرحدوں کو پار نہ کیے جانے کے باب میں سخت زخم خوردہ ہے۔ قومی عزت اور حمیت پر ضرب کاری لگی ہے اور عوام اپنی آزادی اور حاکمیت کی مکمل بحالی چاہتے ہیں۔

۲- ملک کی مغربی سرحد جو ہمیشہ سے محفوظ ترین سرحد تھی، اپنی وہ حیثیت کھو چکی ہے اور اب فوج کا ایک معتد بہ حصہ اس سرحد پر تعینات ہے جس کے نتیجے میں کشمیر اور بھارت دونوں کے محاذ پر کمزوری آئی ہے۔

۳- ملک میں عدم تحفظ میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ملک کی فوج پاکستان کے شہریوں کے

خلاف استعمال ہورہی ہے اور فوج اور عوام دونوں اس کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ۹۰ ہزار فوجی قبائلی علاقوں میں برسرِ پیکار ہیں اور گذشتہ تین سال میں ۱۲۰۰ سے زائد فوجی ہلاک اور ہزاروں زخمی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جنھیں دہشت گرد کہا جا رہا ہے ان کا جانی نقصان بھی اس سے کسی طرح کم نہیں۔ نیز ۳ ہزار سے زیادہ عام شہری جن میں بچے، بوڑھے اور خواتین بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں، لقمۂ اجل بن گئے ہیں۔ پورے علاقے میں انتشار، افراتفری اور خون خرابہ ہے۔ آبادی کے نقل مکانی کا سلسلہ جاری ہے اور بے یقینی اور عدم تحفظ کا دور دورہ ہے۔ فوج اور عوام کے درمیان جو اعتماد، محبت اور تعاون کا رشتہ تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے اور فوج اور حکومت کے اداروں پر حملے روز افزوں ہیں۔ پورے ملک میں بدامنی اور تشدد کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے جو سول سوسائٹی اور مستحکم جمہوری نظام کے لیے بڑا خطرہ ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو ملک مزید عدم استحکام کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا۔

۴- پاکستان کو نائن الیون کے بعد امریکا کے حواری بننے کی بڑی بھاری معاشی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ امریکا تو یہی طعنہ دیتا ہے کہ ہم نے ۱۱ ارب ڈالر کی امداد دی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں سے ۶ ارب ڈالر فوجی خدمات کے معاوضے میں دی گئی ہیں اور اصل معاشی امداد جس کا ایک حصہ قرض کی شکل میں ہے صرف ۵ ارب ہے، جب کہ پاکستان کو ملک اور بیرونی محاذ پر جو معاشی نقصان اس جنگ میں شرکت کی وجہ سے ہوا ہے، اس کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ ۲۰۰۶ء میں صرف پانچ سال کی بنیاد پر خود امریکا کی نارتھ کمانڈ کی ویب سائٹ پر یہ نقصان ۱۰ سے ۱۲ ارب ڈالر قرار دیا گیا تھا۔ آزاد ذرائع کے مطابق گذشتہ سات سال میں یہ نقصان ۱۲ سے ۱۵ ارب ڈالر کا ہے جس کی کوئی تلافی نہیں کی گئی اور نہ اس کا کوئی مطالبہ مشرف حکومت نے کیا، بلکہ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔

۵- نیم غلامی کے اس دور کا ایک اہم نتیجہ جمہوریت کی پامالی، آمرانہ نظام کا استحکام، عدلیہ کی بربادی، بنیادی حقوق کی پامالی اور ملک کو نظریاتی انتشار اور قدیم و جدید اور انتہا پسند

اور روشن خیالی کی کش مکش میں جھونک دینا ہے۔

ان سارے نتائج کو بھگتنے کے بعد قوم بیدار ہو چکی ہے اور عوام، وکلا، طلبہ اور سول سوسائٹی نے ماضی کی پالیسیوں کو ترک کر کے ایک حقیقی جمہوری انداز میں دستور اور قانون کی مکمل پاس داری کرتے ہوئے اور ملک کی آزادی، عزت اور تہذیبی شناخت کے مطابق نئی پالیسیوں کی تشکیل اور ان کی روشنی میں اجتماعی زندگی کی تعمیرنو کا عزم کیا ہے۔ ان حالات میں امریکا کی سفارتی یلغار اور فوجی اقدام کی دھمکیوں کے اصل مقصد اور اہداف کو سمجھنا، اور ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ امریکا دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ ہار چکا ہے اور اس وقت دنیا کے کسی بھی حصّے میں اس کی پالیسی کی تائید موجود نہیں۔ امریکا نے معاشی اعتبار سے بھی ایک بھاری قیمت ادا کی ہے، اور گذشتہ ایک سال میں بقول اکانومسٹ چار بحرانوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یعنی:

> تعمیر مکانات میں مندی، قرضوں کا کمرتوڑ بوجھ، غذائی اشیا اور توانائی کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور ایک کمزور ہوتی ہوئی لیبر مارکیٹ۔ مارچ میں بے روزگاری کی شرح ۵ء۱ فی صد تک بڑھ گئی، جب کہ نجی شعبے میں مسلسل چار مہینوں تک ملازمتوں میں کمی واقع ہوئی۔
> (دی اکانومسٹ، لندن، ۱۲ اپریل ۲۰۰۸ء)

ان حالات میں امریکا کی دھونس میں آکر کسی ایسی پالیسی سے بچنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جس کے نتیجے میں مندرجہ بالا پانچوں نقصانات ہمارا تعاقب کرتے رہیں گے۔ خارجہ پالیسی پر بنیادی نظرثانی اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ سے باعزت بے تعلقی ہمارے ملک میں استحکام، قومی مفاہمت، جمہوری استحکام اور دستور اور قانون کی بالادستی کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے پرویز مشرف اور ان کے حواریوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی نمٹنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ امریکا ایک طرف نئی حکومت کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے پرویز مشرف اور ان کے حواریوں کے کردار کو جاری رکھنے کے لیے بھی ہرممکن کوشش کر رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو سمجھ لینا چاہیے کہ دو کشتیوں میں سواری ایک فعلِ عبث ہے۔ اسے یکسو ہوکر جمہوریت اور عوام کے مینڈیٹ کے مطابق پالیسی سازی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اسی میں ملک و ملّت کی فلاح ہے، اور یہی خود

پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے بہترین مفاد میں ہے۔ امریکا کی حالیہ دھمکیوں، سفارتی ترک تازیوں اور معاشی امداد کی گنڈیریوں کے بارے میں ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ:

مشتری ہوشیار باش!

مسئلہ کشمیر: واضح اور مضبوط موقف کی ضرورت

پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں پاکستانی قوم اور ملّتِ اسلامیہ پر جو ظلم توڑے گئے ہیں اور جو زخم لگائے گئے ہیں، ان میں فلسطین اور القدس سے غداری، اسرائیل سے دوستی، اُمت مسلمہ کے دشمنوں سے پینگیں بڑھانا اور بھارت کے ساتھ دوستی کے نام پر جموں و کشمیر کے مسلمانوں سے بے وفائی اور پاکستان کی اصولی اور تاریخی کشمیر پالیسی کو یک طرفہ طور پر تبدیل کر دینا سرفہرست ہیں۔ آج جب قوم نے تبدیلی کے راستے کو منتخب کیا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر بھی مشرف کی پسپائی اور منافقت کی پالیسی کو یک سر ترک کر کے اس پالیسی کا اعادہ کیا جائے جس کی بنیاد قائداعظم نے رکھی تھی، اور جس پر یہ قوم ہر خطرے کو انگیز کرتے ہوئے پہلے دن سے یکسو تھی۔ واضح رہے کہ کشمیر کا مسئلہ نیا نہیں، تقسیمِ ہند کے نامکمل ایجنڈے کا ایک اہم حصہ ہے اور جب تک یہ مسئلہ حق و انصاف اور بین الاقوامی عہد و پیمان کے مطابق حل نہیں ہوتا، پاکستان اور ہندستان میں تعلقات کے معمول پر آنے کا (normalization) کا کوئی امکان نہیں۔ پھر یہ مسئلہ کسی خطۂ زمین پر تنازع نہیں، یہ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کے حقِ خودارادیت کا مسئلہ ہے۔ انسانی حقوق بھی اس مسئلے کا حصہ ہیں لیکن اصل ایشو جموں و کشمیر کے مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی آزاد مرضی سے کریں۔ پرویز مشرف نے اس مرکزی مسئلے (core issue) کا سارا فوکس تبدیل کر دیا اور اسے محض پاک بھارت تعلقات کا ایک پہلو بنا کر تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے غداری اور جموں و کشمیر کے مسلمانوں سے بے وفائی کا ارتکاب کیا ہے جسے پاکستانی قوم کبھی معاف نہیں کرے گی۔

بھارت نے اپنی روایتی مکاری کے مطابق پرویز مشرف کی تمام پسپائیوں اور یک طرفہ رعایتوں (concessions) کے باوجود کسی ایک پہلو سے بھی مسئلے کے حل کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھایا، بلکہ سیاچن اور سرکریک جیسے مسائل کے بارے میں بھی جو باتیں ۲۰ سال پہلے طے کر لی تھیں ان پر بھی عمل نہیں کیا اور ساری توجہ کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے، عوام پر ظلم و ستم کی حکمرانی کو بڑھانے اور پاکستان کے لیے کشمیر سے آنے والی پانی کی راہیں روکنے کے لیے ڈیم سازی پر مرکوز کی۔ ظلم ہے کہ سندھ طاس معاہدے کے خلاف بھارت ۳۰ سے زیادہ ڈیموں پر کام شروع کر چکا ہے اور کچھ پر مکمل کر چکا ہے اور پرویز مشرف اور ان کے حواری پاکستان کو بنجر بنانے کے لیے اس بھارتی منصوبے تک کا توڑ کرنے سے مجرمانہ غفلت برتتے رہے ہیں۔

پرویز مشرف کی پالیسیوں کا سب سے بڑا نقصان پاکستان کو یہ ہوا ہے کہ ملک اور عالمی سطح پر ہماری اصولی پوزیشن بری طرح مجروح ہوئی ہے اور ہماری آواز میں کوئی وزن نہیں رہا ہے۔ نیز کشمیر میں جو عظیم تحریکِ مزاحمت جاری ہے اور جس میں اب تک ۶ لاکھ افراد اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں، جن میں سے ایک لاکھ تحریک کے حالیہ مرحلے میں شہید ہوئے ہیں، اس تحریک کو پرویز مشرف کی قلابازیوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستان پر جو اعتماد جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو تھا، اس کو شدید دھچکا پہنچا ہے۔ 'کشمیر بنے گا پاکستان' کی تحریک پر ضرب لگی ہے اور جموں و کشمیر کے عوام بھارت کے ساتھ رہنے کو تو نہ پہلے تیار تھے اور نہ اب تیار ہیں، لیکن پاکستان سے جو ان کی اُمیدیں تھیں اور جس طرح وہ پاکستان کو اپنی منزل مراد سمجھتے تھے، اس کیفیت اور اس اعتماد پر ضرب کاری لگی ہے۔ اب بھی وہ پاکستان کی قوم سے اچھی توقعات رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں جو کچھ ہوا وہ پرویز مشرف کی غلط پالیسی کا نتیجہ ہے جس کی اب پاکستانی قوم اصلاح کرے گی۔ گو زخم لگ چکا ہے اور شیشے پر بال آ گیا ہے لیکن ابھی اصلاح کا امکان ہے۔ نئی حکومت کو پاکستان کی تمام بڑی پارٹیوں کے منشور کے مطابق قوم کی متفقہ کشمیر پالیسی کا پوری قوت سے اعادہ کرنا چاہیے کہ اصل مسئلہ حق خودارادیت کا ہے۔ کشمیر ایک متنازع ایشو ہے اور بھارت اور پاکستان کے درمیان یہی اصل مرکزی مسئلہ ہے۔ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی تحریک ہر اعتبار سے تحریکِ آزادی ہے جو ان کا حق ہے اور جس کی تائید ہمارا فرض ہے۔ اس سلسلے میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر

پاکستان کی پارلیمنٹ اور حکومت کو واضح اعلان کرنا چاہیے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار جلد از جلد دیا جائے اور ان سے بھارت کے غاصبانہ قبضے کی تاریک رات کو جلد از جلد ختم کیا جائے، نیز تحریک حریت کی بھرپور تائید کی جائے اور عالمی سطح پر ان کے مسئلے کو اٹھایا جائے۔ اگر مشرقی تیمور اور کوسووا کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور اگر آئرلینڈ کے مستقبل کی صورت گری کو وہاں کے لوگوں کی مرضی کے مطابق کرنے کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے تو جموں و کشمیر کے مسلمان اس حق سے کیوں محروم ہیں؟

بھارت کے ظالمانہ دورِ اقتدار کو ختم ہونا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اس کی مرضی کے بغیر ہمیشہ کے لیے زیردست نہیں رکھ سکتی۔ کشمیر کے مسلمانوں نے اپنی تاریخی اور جرأت مندانہ جدوجہد سے ثابت کردیا ہے کہ وہ بھارت کی غلامی میں رہنے کو تیار نہیں اور بھارت کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہیں۔ حال ہی میں جو اجتماعی قبریں دریافت ہوئی ہیں، ان میں ہزاروں ان جوانوں کو قتل کر کے دفن کیا گیا جو بلاجواز اٹھا لیے گئے تھے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ان قبروں پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے اور اسے ایک بین الاقوامی ایشو کے طور پر اٹھایا ہے، مگر پاکستان کی حکومت اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ بلاشبہہ اس وقت حکومت بڑے مشکل حالات میں گھری ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود کشمیر کے مسئلے پر ہر محاذ پر ضروری اقدام وقت کی ضرورت ہے۔ اعتماد سازی کے اقدامات (CBMS) کے دھوکوں کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ جموں و کشمیر کے عوام کو ان کا حق خودارادیت دیا جائے اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ کریں، اسے خوش دلی سے قبول کرلیا جائے۔ پرویز مشرف کی کشمیر پالیسی میں جو حماقتیں اور بے وفائیاں کی گئی ہیں اور اس سے جو دکھ اور نقصان تحریک آزادیِ کشمیر کو ہوا ہے، اس کا اعتراف کر کے تلافی کا سامان کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آج بھی پاکستان کی حکومت اور پارلیمنٹ عوام کے دلی جذبات کے مطابق اپنے اصولی اور تاریخی پالیسی کا بھرپور اعادہ کرے اور اس پر عمل درآمد کے لیے ہمہ جہتی پروگرام بنا کر مؤثر کام کرے تو کشمیری عوام سابقہ قیادت کی غلطیوں سے درگزر کریں گے، اور اس جوش اور جذبے سے پاکستان سے یگانگت اور یک جہتی کا اظہار کریں گے جو ان کی ۶۰ سالہ تحریکِ آزادی کا طرۂ امتیاز ہے۔

قائدِ حریت سید علی شاہ گیلانی اور کے ایل ایف کے قائد یٰسین ملک کا ایک پلیٹ فارم سے کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم اور بھارت کے تحت انتخابات کا بائیکاٹ یہ امید دلاتا ہے کہ تحریک حریت سے وابستہ تمام قوتیں مل کر اپنے مشترک مقصد کے لیے ایک بار پھر میدان میں اُتر رہی ہیں۔ سیاسی اور جہادی سب قوتوں کو مل کر کشمیر کی بھارت سے آزادی کی جدوجہد کو اپنے آخری نتیجے تک پہنچانا ہے اور پاکستان کی قوم اور قیادت اس جدوجہد میں اپنا قرار واقعی کردار ادا کرے گی۔ پارلیمنٹ کو اس سلسلے میں پوری یکسوئی اور جرأت کے ساتھ ملت اسلامیہ پاکستان کی کشمیر پالیسی کا اعلان کرنا چاہیے اور اس پر عمل کے لیے مؤثر پروگرام وضع کرنا چاہیے۔ یہ وقت جموں و کشمیر کے عوام اور ان کی تحریک آزادی کے ساتھ مکمل یک جہتی کے اظہار اور ان کی تقویت کے لیے ہر ممکن ذرائع کے استعمال کا ہے۔

طاغوت

'طاغوت' لغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اِصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی وخداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اُصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اِس کا نام فِسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اُصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اَور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۹۶-۱۹۷)

طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حُسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوب صورتی میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ معبُودانِ غیراللہ کو طاغوت اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے، وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۳۶۶)

'طاغوت' سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند

ماننا ہو۔لہٰذا... جو عدالت 'طاغوت' کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم وملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔ (ایضاً، ص ۳۶۶-۳۶۷)

کسی کے طاغوت ہونے کے لیے اس کا خود طاغی (سرکش) ہونا تو شرطِ اوّل ہے۔ رہی دوسری شرط تو وہ محض پوجا جانا نہیں ہے، بلکہ اس پوجے جانے میں اس کی اپنی خواہش اور کوشش کا دخل بھی ہونا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر طاغوت وہ ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی کی ہو، بلکہ اِس سرکشی میں یہاں تک بڑھ گیا ہو کہ خدا کے بجاے اس نے اپنے آپ کو لوگوں کا رب اور اِلٰہ بنانے کی کوشش کی ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے بتوں پر یا ان بزرگوں پر جن کو مرنے کے بعد بت بنایا گیا، طاغوت کا اطلاق نہ ہوگا۔ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، حصّہ اوّل، ص ۱۲۲)

خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا، بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے، جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدابہار سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی اور بچے، اعزہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور راہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اُس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکّر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۹۷)

طاغوت کا مصدر 'طغیان' ہے جس کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں۔ دریا جب اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں: طغیانی آ گئی ہے۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گزر کر

اس غرض کے لیے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصے سے زائد فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے اور اس کے مقابلے میں راہِ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانونِ عدل دنیا میں قائم ہو۔ لڑنے والا خود بھی اس کی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے، چنانچہ قرآن کہتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (القصص ۲۸:۸۳) آخرت میں عزت کا مقام تو ہم نے صرف ان لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ عاقبت کی کامیابی صرف خدا ترس لوگوں کے لیے ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ''راہِ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لیے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے، تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیّت کا جوش ہوتا ہے، اس لیے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''کسی کی بھی نہیں، فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا''۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اُونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہوگیا''۔

اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لیے ہو اور کوئی شخصی یا جماعتی غرض پیشِ نظر نہ ہو۔ پس جہاد کے لیے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جان دار کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے پورا زور صرف کر رہا ہے، لیکن 'مسلمان' جس انقلابی جماعت کا نام ہے، اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان و مال کھپاؤ، دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو، اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کرو، نہ اس لیے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم ان کی جگہ لے لو، بلکہ صرف اس لیے کہ دنیا سے سرکشی وطغیان مٹ جائے اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو۔ (اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ص ۲۴۵-۲۴۶)

ترتیل سے تلاوت: مفہوم اور حکمت

وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ٥ (المزمل ۷۳:۴)
اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔

[جب حضورؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ] آدھی رات تک تہجد میں مشغول رہا کر، یا کچھ بڑھا گھٹا دیا کر، اور قرآن شریف کو آہستہ آہستہ ٹھیر ٹھیر کر، پڑھا کر تا کہ خوب سمجھتا جائے، اس حکم کے بھی حضورؐ عامل تھے۔ حضرت صدیقہؓ کا بیان ہے کہ آپ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے بڑی دیر میں سورت ختم ہوتی تھی۔ گویا چھوٹی سی سورت بڑی سے بڑی ہو جاتی تھی، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا وصف پوچھا جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: خوب مد کر کے حضورؐ پڑھا کرتے تھے۔ پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر سنائی جس میں لفظ اللہ پر، لفظ رحمٰن پر، لفظ رحیم پر مد کیا۔ ابن جریج میں ہے کہ ہر ہر آیت پر آپ پورا وقف فرمایا کرتے تھے جیسے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر وقف کرتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر وقف کرتے، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر وقف کرتے، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھ کر ٹھیرتے۔ یہ حدیث مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کے قاری سے قیامت والے دن کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ترتیل سے پڑھ، جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا۔ تیرا درجہ وہ ہے جہاں تیری آخری آیت ختم ہو۔ یہ حدیث ابوداؤد و ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔

[بہت سی] احادیث ہیں جو ترتیل کے مستحب ہونے اور اچھی آواز سے قرآن پڑھنے پر

دلالت کرتی ہیں، جیسے وہ حدیث جس میں ہے قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو، اور ہم میں سے وہ نہیں جو خوش آوازی سے قرآن نہ پڑھے، اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی نسبت حضورؐ کا یہ فرمانا کہ اسے آلِ داؤد کی خوش آوازی عطا کی گئی ہے اور حضرت ابوموسیٰؓ کا فرمانا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپؐ سن رہے ہیں تو میں اور اچھے گلے سے زیادہ عمدگی کے ساتھ پڑھتا، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان کہ ریت کی طرح قرآن کو نہ پھیلاؤ اور شعروں کی طرح قرآن کو بے تہذیبی سے نہ پڑھو، اس کے عجائب پر غور کرو اور دلوں میں اثر لیتے جاؤ اور اس کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ جلد سورت ختم ہو۔ (بغوی)۔ ایک شخص آ کر حضرت ابن مسعودؓ سے کہتا ہے: میں نے مفصل کی تمام سورتیں آج کی رات ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالیں۔ آپ نے فرمایا: پھر تو تو نے شعروں کی طرح جلدی جلدی پڑھا ہوگا، مجھے وہ برابر برابر کی سورتیں خوب یاد ہیں جنھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ملا کر پڑھا کرتے تھے۔ پھر مفصل کی سورتوں میں سے ۲۰ سورتوں کے نام لیے کہ ان میں سے دو دو سورتیں حضورؐ ایک ایک رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، عمادالدین ابوالفدا ابن کثیر، ص ۳۸۴-۳۸۵)

ترتیلِ قرآن کا مطلب

● ترتیل کے لفظی معنی کلمے کو سہولت اور استقامت کے ساتھ منہ سے نکالنے کے ہیں (مفردات امام راغب)۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن میں جلدی نہ کریں، بلکہ ترتیل و تسہیل کے ساتھ ادا کریں اور ساتھ ہی اس کے معانی میں تدبر و غور کریں (قرطبی)۔ ورتّل کا عطف قم الّیل پر ہے اور اس میں اس کا بیان ہے کہ رات کے قیام میں کیا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ تہجد اگرچہ قراءت و تسبیح، رکوع و سجود سبھی اجزاے نماز پر مشتمل ہے مگر اس میں اصل مقصود قراءتِ قرآنی ہے۔ اسی لیے احادیثِ صحیحہ اس پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز بہت طویل ادا فرماتے تھے۔ یہی عادت صحابہ و تابعین میں معروف رہی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کا صرف پڑھنا مطلوب نہیں، بلکہ ترتیل مطلوب ہے جس میں ہر ہر کلمہ صاف صاف اور صحیح ادا ہو۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ترتیل فرماتے تھے۔ حضرت اُم سلمہؓ سے بعض لوگوں نے رات کی نماز میں آپ کی تلاوتِ قرآن کی

کیفیت دریافت کی تو انھوں نے نقل کر کے بتلایا جس میں ایک ایک حرف واضح تھا۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، از مظہری)

ترتیل میں تحسینِ صوت، یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی قراءت وتلاوت کو ایسا نہیں سنتا جیسا اُس نبی کی تلاوت کو سنتا ہے جو خوش آوازی کے ساتھ جہراً تلاوت کرے۔ (مظہری)

.....اور اصل ترتیل وہی ہے کہ حروف و الفاظ کی ادایگی بھی صحیح اور صاف ہو، اور پڑھنے والا اس کے معانی پر غور کر کے اُس سے متاثر بھی ہو رہا ہو، جیسا کہ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک شخص پر ہوا، جو قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنا ہے: وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا بس یہی ترتیل ہے (جو یہ شخص کر رہا ہے) (القرطبی)۔ (معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ج ۸، ص ۵۹۰-۵۹۱)

● رَتَل کسی چیز کی خوبی، آرایش اور بھلائی کو کہتے ہیں اور رَتّل کے معنی سہولت اور حسنِ تناسب کے ساتھ کسی کلمے کو ادا کرنا ہے، نیز اس کا معنی خوش آوازی سے پڑھنا، یا پڑھنے میں خوش الحانی اور حسنِ ادایگی میں حروف کا لحاظ رکھنا، اور ہر لفظ کو ٹھیر ٹھیر کر اور الگ الگ کر کے پڑھنا ہے۔ اور اس طرح پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر لفظ کی ادایگی کے ساتھ ساتھ انسان اس کے معانی پر غور کرسکتا ہے اور یہ معانی ساتھ کے ساتھ دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ (تیسیر القرآن، مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، ج ۴، ص ۵۳۹)

● علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ترتیل کا معنی ہے: بڑی خوب صورتی سے منظم اور مرتب ہونا۔ وہ منہ جس کے دانت خوب صورت اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں، اسے ثغر رتل کہتے ہیں، یعنی کوئی دانت اُونچا نیچا نہیں، کوئی جگہ خالی نہیں، کوئی دانت ٹوٹا ہوا نہیں۔ اسی مناسبت سے ترتیلِ قرآن کا معنی ہوگا کہ اس کو آہستہ آہستہ، سوچ سمجھ کر پڑھا جائے اور اس کی تلاوت میں تیزی نہ کی جائے۔ اس آیت کی جامع اور دل نشین تفسیر حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے۔

آپ سے اس آیت کا مفہوم پوچھا گیا تو ارشاد فرمایا..... اس آیت کا معنی ہمارے نبی کریمؐ نے ہمیں بتایا کہ جس طرح تم جلدی جلدی ردی کھجوریں بکھیرتے چلے جاتے ہو، اور بال کاٹتے چلے جاتے ہو، ایسا نہ کرو۔ جب کوئی نادر نکتہ آئے تو ٹھیر جاؤ، اپنے دل کو اس کی اثرانگیزی سے متحرک کرو۔ تمھیں اس سورت کو جلدی جلدی ختم کرنے کی فکر نہ ہو۔ (ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ ازہری، ج ۵، ص ۴۰۲)

● ترتیل کی تفسیر میں معصومینؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کے وسیع الابعاد وجہات میں سے کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے.....

حضرت امام صادق سے 'ترتیل' کی تفسیر میں یہ آیا ہے: جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جنت کا ذکر ہو تو رُک کر خدا سے جنت کا سوال کرو (اور اس کے لیے اپنی اصلاح کرو)، اور جب تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنّم کا ذکر ہو، تو خدا سے اس سے پناہ مانگو (اور خود کو اس سے دُور رکھو)۔

.....ایک اور حدیث میں انھی حضرت سے اس طرح نقل ہوا ہے: قرآن کو جلدی جلدی، سرعت اور تیزی کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنّم کا ذکر ہو، تو وہاں رک جاؤ اور خدا سے جہنّم کی آگ سے پناہ مانگو.....

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمان اس واقعیت سے بہت دُور ہوگئے ہیں، اور انھوں نے قرآن کے صرف الفاظ پر اکتفا کرلیا ہے، اور ان کا مقصد صرف سورت اور قرآن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ یہ جانیں کہ یہ آیات کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ اور کس پیام کی تبلیغ کر رہی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ بھی محترم ہیں، اور ان کو پڑھنا بھی فضیلت رکھتا ہے لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ الفاظ اور تلاوت ان کے مطالب و مضامین کو بیان کرنے کا مقدمہ اور تمہید ہے۔ (تفسیر نمونہ، ج ۲۵، ص ۱۵۱-۱۵۲)

● [گویا یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ] تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھیرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب

اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قراءت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں، بلکہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ہونی چاہیے.....

حضرت حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضوؐر کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا، وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دُعا کا موقع آتا، وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا، وہاں پناہ مانگتے (مسلم، نسائی)۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضوؐر اِس مقام پر پہنچے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو غالب اور دانا ہے) تو اسی کو دُہراتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی (مسنداحمد، بخاری)۔ (تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ج ۶، ص ۱۲۶-۱۲۷)

● [یہاں] قرآن کے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا [ہے] کہ نماز میں اس کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضوؐر قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف کرتے، کبھی کبھی ایک ہی آیت شدتِ تاثر میں بار بار دہراتے۔ علاوہ ازیں کوئی آیت قہر و غضب کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی، اس پر ادائے شکر فرماتے۔ بعض آیتیں جن میں سجدے کا حکم یا اشارہ ہے، ان کی تلاوت کے وقت، فوری امتثالِ امر کے طور پر آپ سجدے میں بھی گر جاتے۔

تلاوتِ قرآن کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بھی ہے اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول بھی ہے۔ قرآن کے مقصدِ نزول کے پہلو سے بھی یہی طریقہ نافع ہوسکتا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ طریقہ صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ قرآن کو فکر و تدبر کی چیز اور زندگی کی رہنما کتاب سمجھتے رہے۔ بعد میں جب قرآن صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی چیز بن کے رہ گیا تو یہ اس طرح پڑھا جانے لگا جس کا مظاہرہ ہمارے حفاظ کرام تراویح اور شبینوں میں کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ج ۸، ص ۲۳-۲۴)

ترتیل کی حکمت

یہ [دراصل] ایک عظیم مہم کے لیے من جانب اللہ تربیت تھی اور اس تربیت میں ایسے ذرائع استعمال کیے گئے جن کی کامیابی کی ضمانت من جانب اللہ دی گئی تھی۔ قیام اللیل، جس کی زیادہ سے زیادہ حد نصف رات یا دو تہائی سے کم یا ایک تہائی ہے، اس میں صرف ترتیل قرآن اور نماز ہوتی ہے۔ ترتیل قرآن کا مطلب ہے قرآن کو تجوید کے ساتھ قرآن کے اصولوں کے مطابق پڑھنا، جلدی جلدی بھی نہ ہو اور محض گانے بجانے کا انداز بھی نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایات وارد ہیں کہ آپؐ نے قیام اللیل کے دوران گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھا تھا لیکن ان گیارہ رکعات میں رات کے دو تہائی حصے سے قدرے کم وقت گزارتے تھے اور آپؐ قرآن مجید کو خوب رُک رُک کر تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تربیت اس لیے کی جارہی تھی کہ ایک بھاری ذمہ داری آپؐ کے سپرد کی جانے والی تھی..... راتوں کو جاگنا، جب کہ لوگ سو رہے ہیں، اور روزمرہ کی زندگی کی کدورتوں سے دُور ہونا، اور دنیاوی جھمیلوں سے ہاتھ جھاڑ کر اللہ کا ہو جانا، اور اللہ کی روشنی اور اللہ کے فیوض وصول کرنا، اور وحدت مطلقہ سے مانوس ہونا، اور اس کے لیے خالص ہوجانا، اور رات کے سکون اور ٹھیراؤ کے ماحول میں ترتیل قرآن، ایسی ترتیل کہ گویا یہ قرآن ابھی نازل ہو رہا ہے اور یہ پوری کائنات اس قرآن کے ساتھ رواں دواں ہے۔ انسانی الفاظ اور عبارات کے سوا ہی یہ پوری کائنات قرآن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ قیام اللیل میں انسان قرآن کے نور کی شعاعیں، اس کے اشارات، نہایت پُرسکون ماحول میں حاصل کرتا ہے اور یہ سب اس دشوارگزار راستے کا سازوسامان ہے۔ کیونکہ اس کٹھن راستے کی مشکلات رسولؐ اللہ کے انتظار میں تھیں اور یہ ہر اس شخص کا انتظار کرتی ہیں، جو بھی اس دعوت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ جو شخص بھی جس دور میں دعوتِ اسلامی کا کام کرتا ہے، شیطانی وساوس اور اس راہ کے تاریک ترین لمحات میں یہی زادِ راہ کسی داعی کے کام آتا ہے اور اس سے اس کی راہ روشن ہوتی ہے (فی ظلال القرآن، سید قطب شہیدؒ، ترجمہ: معروف شاہ شیرازی، ج ۶، ص ۶۷۶-۶۷۷)۔ (انتخاب و ترتیب: امجد عباسی)

اسلامی تحریکیں: حال اور مستقبل

ڈاکٹر محمد شفیق ملک ○

غلبۂ اسلام کے لیے کوشاں اسلامی تحریکیں ہمیشہ موضوع بحث رہی ہیں۔ دہشت گردی کے نام پر مسلط کی جانے والی عالمی جنگ میں اس حوالے سے بحث جاری ہے۔ مغرب میں کی جانے والی ان تحقیقات کا غالب حصہ منفی اہداف رکھتا ہے۔ زیرنظر تحریر ڈاکٹر شفیق ملک کے پی ایچ ڈی مقالے کا آخری باب ہے جس میں اسلامی تحریکوں کو درپیش مسائل، خدشات اور مستقبل کے امکانات کا مثبت جائزہ لیا گیا ہے، اور لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

اسلامی تحریکیں امت کو جمود، پستی، غلامی اور خودفراموشی سے نکالنے کے لیے اٹھی ہیں۔ اس کے لیے جہاں اَن تھک جدوجہد ضروری ہے، وہیں ان خطرات کی سنگینیوں کا احساس اور تدارک بھی ضروری ہے جن سے یہ تحریکیں دوچار ہوسکتی ہیں۔

ان خطرات میں سب سے پہلے وہ نوجوان ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں دین پر عمل کی رفتار سست ہے۔ وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ شریعت اور دین واخلاق کے منافی مظاہروں کو ہرصورت میں فوراً ختم ہونا چاہیے۔ وہ اسلام کی خوبیوں کے ادراک کے لیے وقت دینے کو تیارنہیں ہیں۔ نتائج کے سلسلے میں عجلت پسندی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو بار بار صبر کی تلقین کی۔ اس لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اجتماعی اصلاح و تربیت کے عمل کی کامیابی کے لیے، عجلت پسندی کے بغیر، ایک بھرپور اور طویل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

○ لیکچرار، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، تلہ گنگ

بعض افراد میں انتہاپسندی کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ انتہاپسندی کی وجہ سے دعوت اور پُرامن ذرائعِ انقلاب پر اعتماد کمزور ہوتا ہے اور تشدد اور مسلح انقلاب کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ اسلام نے انتہاپسندی کی مذمت کی ہے اور غلطیوں کی اصلاح کے لیے حکمت کا رویہ اپنانے پر زور دیا ہے۔ اسلامی بیداری کو انتہاپسندی سے اجتناب کرنا چاہیے تاکہ نوجوان تشدد کی راہ نہ اختیار کریں۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۴۳-۴۴)

خرم مراد اس معاملے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ساری جدوجہد کا اصل مطلوب صرف ایک ہے، اپنے لیے اور دوسرے افراد کے لیے، جنت کا حصول ممکن بنانا ___ اسی لیے پہلے مرحلے میں اصل اہمیت افراد کی ہے، نہ کہ اجتماعی نظام کی چنانچہ اجتماعی اصلاح کی خاطر کوئی ایسے طریقے اختیار کرنا ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا جن سے افراد کی اصلاح کا دروازہ بند ہوتا ہو، یا وہ جنت سے دُور اور آگ سے قریب ہوتے ہوں۔ تشدد سے دلوں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ لوگوں کو مارنے سے ان کی ہدایت کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔ لوگوں کو ہلاک کرنا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب ان پر اتمامِ حجت ہوگئی ہو، اور ان کی اصلاح سے مایوسی۔ اس کا تعین وحی الٰہی کے بند ہوجانے کے بعد ممکن نہیں۔ اس لیے اِلاّ یہ کہ اللہ کے احکام کے مطابق جہاد کرتے ہوئے مخالفین مارے جائیں، صرف دین کی مخالفت یا گناہوں کی سزا میں لوگوں کو ہلاک کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ بے گناہوں کو، خصوصاً عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مارنا تو جہاد میں بھی منع ہے۔ اسی طرح اگر مسلح انقلاب کی کوشش میں لوگ کثرت سے مارے جائیں، آبادیاں ملبے کا ڈھیر بن جائیں تو پاکیزہ نظام کن لوگوں پر قائم ہوگا اور اس کی برکات سے کون مستفید ہوگا۔ کیا صرف چند پاکیزہ نفوس؟

گن پوائنٹ پر ایک دل بھی سیدھا نہیں ہوسکتا، کجا یہ کہ سیاست، ثقافت، صحافت، ادب اور قوم سب کو سیدھا کر دیا جائے۔ خود پاکستان میں مارشل لا کے ناکام تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ آئے تھے تو میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ ''آپ مسیحا کا رول نہ سنبھالیں۔ اگر ڈنڈے سے قوم کی اصلاح ہوا کرتی تو اللہ تعالیٰ انبیا کے بجاے فیلڈ مارشل ہی مبعوث کیا کرتا''۔ چنانچہ دعوت دین کی جدوجہد کرنے والوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو جانتے نہیں،

ان کے سامنے حق پہنچانا ہے۔ مطلوب حد تک یہ فرض ادا کیے بغیر طاقت کے استعمال کا جواز نہیں۔ جن بے خبر اور غفلت و جہالت کے شکار لوگوں کے سامنے ابدی زندگی کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہم ابھی تک ادا نہیں کر سکے، ان کو سینما ہال میں بیٹھے بیٹھے موت کا پیغام پہنچا دینا، کس طرح اللہ کو پسند ہوسکتا ہے؟ حوا کی جن بیٹیوں کے کانوں میں اب تک ہم وہ تریاق نہیں ڈال سکے، جو ان کے دلوں کو سلیم بنا سکتا ہے، ان کے اوپر تیزاب ڈال کر ان کے چہرے مسخ کر دینے سے آخر کوئی فرد جنت کا مستحق کیسے بن سکتا ہے؟

طاقت کا استعمال اگر جائز بھی ہو تو اس کے لیے ایک سرجن کی سی ہمدردی، سوز اور مہارت ضروری ہے۔ جہاں اس کے استعمال کے پیچھے مایوسی، غصے اور نفرت کے نفسانی جذبات کارفرما ہوں تو نہ وہ راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے فلاح کا باعث ہوسکتا ہے اور نہ مقصد اصلاح کے لیے سودمند ہوسکتا ہے۔ (خرم مراد، تحریک اسلامی، اہداف، مسائل، حل، ص ۸۹-۹۰)

اس لیے جب تک پرامن ذرائع سے دعوت پہنچانے، منوانے اور اجتماعی تبدیلی لانے کے راستے کھلے ہوئے ہوں اور جس وقت تک راے عامہ اسلامی انقلاب کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو جائے، اس وقت تک اسلحہ اٹھا کر جہاد کرنا صحیح نہیں ہوگا اور حکمرانوں کے چند اقوال و افعال کی بنیاد پر ان کی تکفیر کر کے ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا تو کوئی حکم ہمیں نہیں ملتا۔

اسی لیے سید مودودی نے واضح طور پر فرمایا تھا: آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں، وہاں ایک آئینی اور جمہوری نظام قائم ہے۔ اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک آئینی راستہ ہے، انتخابات۔ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلیِ قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا، شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں۔ اسی بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔ (سید مودودی، تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل، ص ۲۰۵)

برائی کو ہاتھ سے روکنا یقیناً اسلام کا حکم ہے لیکن حکم اس چیز کے لیے ہے جو ہمارے دائرہ اختیار میں ہو، جہاں یقینی ہو کہ ہاتھ کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اصلاح کا امکان نہیں، جہاں ایک منکر کے ازالے سے دوسرا اس سے بڑا منکر وجود میں نہ آئے، خصوصاً فساد فی الارض جیسا منکر نمودار

ہو، وہاں یہ طریقہ کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

پُرامن اعلاے کلمۃ الحق میں یقیناً ابھی کامیابی نہیں ہورہی اور دیر لگ رہی ہے لیکن کیا مسلح جدوجہد کے ذریعے سے کامیابی ہورہی ہے یا جلد منزل ہاتھ آتی نظر آرہی ہے؟ اگر ایک طرف الجیریا، ترکی اور پاکستان میں ناکامی کی مثالیں ہیں تو دوسری طرف مسلح جدوجہد کے باوجود شام، مصر، افغانستان اور خود الجیریا میں بھی ناکامی کی مثالیں موجود ہیں۔ یقیناً جہاں پُرامن ذرائع سے کام ہورہا ہے، وہاں غلط حکومتیں قائم ہیں اور بگاڑ بڑھ رہا ہے لیکن جہاں طاقت استعمال ہورہی ہے کیا وہاں پر غلط حکومتیں گر رہی ہیں اور بگاڑ کم ہورہا ہے؟ (خرم مراد: تحریک اسلامی، اہداف، مسائل، حل، ص ۹۳)

سید مودودی ۱۹۶۲ء میں مکہ مکرمہ میں ان عرب نوجوانوں سے خطاب کر رہے تھے جو ۱۰ سال سے بدترین جبر واستبداد اور تعذیب وتشدد کا شکار تھے۔ ان عرب طلبہ سے سید مودودی نے فرمایا: میری آخری نصیحت یہ ہے کہ آپ کو خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے، اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پایدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہوجائے تو یاد رکھیں جس راستے سے آئے گا، اسی راستے سے وہ ہٹایا جا سکے گا۔ (تفہیمات، ج ۳، ص ۸)

ایک اور جگہ پر سید مودودی کہتے ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے کارکنوں کو ہر طرح کے خطرات ونقصانات برداشت کر کے بھی علانیہ، پُرامن اعلاے کلمۃ الحق کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کو قید وبند سے دوچار ہونا پڑے، یا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانے کی نوبت آئے۔ (تصریحات، ص ۱۵۷)

لادین حکومتیں

اسلامی تحریکوں کو ان مسلمانوں سے خطرات لاحق ہیں جن کی فکر ان کی فکر سے میل نہیں کھاتی۔ ان خطرات کے دو اہم مصدر ہیں۔ بعض مسلمان حکومتیں جو اس بیداری کی مخالف ہیں اور اس بیداری کو مکمل طور پر ختم کر دینا یا عام زندگی میں بے اثر بنا دینا چاہتی ہیں۔ ان ممالک کے دستور میں صراحت سے لکھا ہے کہ وہ سیکولر ہیں یا ان کے حکمران اپنی سوچ میں بالکل سیکولر ہیں۔ ان حکمرانوں کی سیاسی تربیت اور تہذیبی اٹھان مغربی تہذیب کے اداروں میں ہوتی ہے جو اب بھی بہت سے معاملات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے اپنی من مانی کراتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے یہ تربیت یافتہ شاگردان کے رٹائے ہوئے سبق کو کچھ زیادہ ہی اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں اور اس کو نافذ کرنے میں اتنا زیادہ آگے نکل جاتے ہیں کہ ان کے مربی حضرات خود اپنے شاگردوں کو سختی اور تشدد کم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

دوسری وہ حکومتیں ہیں جو اسلام کی کھلم کھلا مخالف نہیں ہیں، بلکہ کچھ نہ کچھ اسلام کے حق میں بھی کام کرتی ہیں اور اسلام کو اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن جس اسلام کو یہ حکومتیں اختیار کرتی ہیں وہ حکومتی اسلام ہے، تاکہ وہ اقتدار سے فائدہ اٹھانے والوں کے مفادات کے لیے خطرہ نہ بنے۔ اس لیے ہر وہ شخص جو اسلام کو اس کے پورے حسن و جمال کے ساتھ اور مکمل طور پر نافذ کرنے کی بات کرتا ہے، وہ ان حکومتوں کی نظروں میں بنیاد پرست، انتہاپسند اور ملک اور باشندگانِ ملک کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ وہ اس شخص پر بغاوت اور حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا الزام ثابت نہیں کر پاتیں لیکن دہشت، تعذیب اور سزاے موت تک کے تمام حربے استعمال کرتی ہیں۔ وہ انسانی حقوق کے معمولی سے حق سے بھی اسے محروم رکھتی ہیں۔ یہ سب کچھ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق سے متعلق عالمی تنظیموں کی نگاہوں کے سامنے انجام پاتا ہے مگر کوئی بھی مداخلت یا احتجاج کرنے کا روادار نہیں ہوتا۔ بعض حکومتیں اسلام کی طرف اپنا میلان اس لیے ظاہر کرتی ہیں کہ ناپسندیدہ اسلامی تحریک کی قوت کا اندازہ کر کے اسے کچل دیں جیسا کہ گذشتہ برسوں میں کئی مسلم ممالک میں ہوا ہے۔

اسلامی تحریک کو ان دونوں طرح کی حکومتوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن اسے

کہ ''اسلامی تحریکیں ہر مسلم معاشرے کا اندرونی معاملہ ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی طاقتیں اس پر کڑی نظر رکھ رہی ہیں۔ مغرب کے بیش تر ملکوں میں خارجہ امور کی وزارتیں، مراکز برائے تحقیق اور اسٹرے ٹیجک مطالعات، ان ملکوں کی جامعات، استشراق کے مراکز تحقیق اور حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے یہ موضوع اہم ترین بن گیا ہے۔ اسلامی بیداری، بنیاد پرستی اور سیاسی اسلام پر مغرب میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے، وہ تمام مسلم ممالک میں ان موضوعات پر لکھے گئے مواد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اسلامی بیداری کی تحقیق اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب اقدامات اختیار کرنے کی غرض سے متعدد کانفرنسوں اور اجتماعات کا انعقاد بھی کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکی خفیہ ادارے (سی آئی اے) نے ۱۹۸۳ء میں اسلامی بیداری پر ۱۲۱ کانفرنسوں کے انعقاد کے مصارف کا بار اٹھانے کی ذمہ داری لی تھی''۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۴۶)

عالمی طاقتوں کی دل چسپی کا ایک سبب ان کا یہ احساس ہے کہ اگر مسلم معاشرہ اسلام کی طرف واپس آ گیا تو مسلم ممالک میں ان کے مفادات پر ضرب پڑے گی۔ وہ مستقبل میں اسلام کے تہذیبی غلبے کے خطرے کا احساس کر رہے ہیں جس نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کی استعماری طاقتیں مسلسل یہ کوشش کر رہی ہیں کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اسلام کا کوئی اثر قائم نہ ہو سکے اور اپنے اہداف کے حصول کے لیے مغربی ادارے براہ راست اور بالواسطہ اسلام کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ انقلابات، ہنگامے، اقتصادی بائیکاٹ، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے الزامات اور اسلامی بیداری سے وابستہ افراد کی کردار کشی اور مسلمان ملکوں پر حملے ان کے واضح حربے ہیں۔ عالمی میڈیا اور خود عالم اسلام کا میڈیا تک اس میں ملوث ہے۔

یہ طاقتیں مسلسل اس بات کی کوشش کر رہی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح مسلم ملکوں کی حکومتوں پر دباؤ ڈال کر اسلامی فکر کو ختم کر دیں۔ کبھی سفارتی دباؤ کے ذریعے، کبھی ان ملکوں میں بسنے والی اقلیتوں کے مفاد میں گہری دل چسپی کے ذریعے۔ وہ حکومتیں جو ان کے دباؤ کے آگے نہیں جھکتیں اور ملک کی داخلی سیاست میں مداخلت گوارا نہیں کرتیں، انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس عداوت کا مطالبہ ان مغربی ملکوں سے بھی کیا جاتا ہے، جہاں مسلم اقلیتیں بستی ہیں۔

خطرہ دونوں سے ہے۔ پہلی قسم کی حکومتوں سے خطرہ عقیدے کی دشمنی پر مبنی ہے جس سے بچنا ناممکن ہے۔ دوسری قسم کی حکومتوں سے خطرہ اس تصورِ اسلام کو کمزور کرنے کا ہے جس کی نمایندگی اسلامی بیداری کرتی ہے۔ بسا اوقات حکمراں یہ سمجھتے ہیں اور ان کے بیرونی آقا اور اندرونی مشیر انھیں یہی سمجھاتے ہیں کہ اسلامی تحریکوں کا اسلام انتہا پسند ہے جس کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں ہے۔ یہ بنیاد پرست عصرِ حاضر کی ترقی کے مخالف ہیں۔ یہ تمھاری حکومت اور امن و امان کے لیے اور عالمی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ امت قرونِ اولیٰ کی طرف لوٹ جائے۔ ان حکومتوں سے جو خطرات ہوتے ہیں، ان میں ظلم و جبر کے ذریعے تحریک کا خاتمہ کرنا۔ اس کے افراد پر عرصہ حیات تنگ کرنا، اس کے دعوتی اداروں کو کام کرنے سے روکنا، لوگوں کو اس تحریک سے متنفر کرنا، میڈیا کے مختلف وسائل و ذرائع کو اس کے خلاف استعمال کرنا اور پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت کے باوجود، عملاً قائم کرنے کی اجازت نہ دینا شامل ہیں۔

دوسرا خطرہ دیگر غیر اسلامی گروہوں سے ہے جو اسلام کی مخالفت اپنے اصول کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ان کے لیے خطرہ ہے۔ بعض گروہ چاہتے ہیں کہ مسلم معاشرہ ہر معاملے میں لبرل ہو اور مغربی تہذیب کی نقالی کرے۔ ان کے خیال میں دنیا میں عزت اور ترقی کی یہی راہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلم سوسائٹی میں سینما، ڈرامے اور فن کاری کے ذریعے اور سودی اداروں کے واسطے سے برائی کا چلن عام ہو۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد احتیاط اور فہم و بصیرت سے کام لیں۔ مسلم حکومتوں سے معاملہ کرنے کے لیے قابلِ قبول وسیلہ تلاش کریں۔ حکمت عملی، موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دین کا کام کریں، مسلح آویزش، افراتفری اور بدامنی پیدا کرنے سے بچیں کہ یہ مزید مشکلات کا سبب بنتے ہیں۔ حقیقی صورت حال کا ادراک کر کے تعمیری افہام و تفہیم کا ماحول پیدا کریں تا کہ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے سازگار مواقع پیدا ہوں۔

عالمی استعمار کا رویہ

ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مانع حماد الجہنی نے ایک انٹرویو میں کہا

مغربی صحافت کا مشاہدہ کرنے والا شخص اس طرح کی کوششیں واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر The Flame نامی برطانوی میگزین میں ایک مقالہ 'برطانیہ کی خاطر جنگ' کے عنوان سے شائع ہوا اور اس میں یہ بات کہی گئی کہ اگر مغربی ممالک اور خاص کر برطانیہ بیدار نہیں ہوتا تو وہ دن آنے والا ہے جب مسلمان ان ملکوں کو حجاب اختیار کرنے، حلال گوشت کھانے، سودی بنکوں کو ختم کرنے اور اسلامی زندگی کے مظاہر اختیار کرنے پر مجبور کر دیں گے۔

اسی طرح ایک امریکی رسالے The Chicago Tribune میں ایک مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا: 'اسلام اور تبدیلی کی ہوائیں'۔ اس مضمون میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ عالم اسلام بنیاد پرستی کی بنیاد پر تبدیلی کی جس نئی لہر کا محتاج ہے۔ مغرب اس کا از سر نو جائزہ لے''۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۴۶-۴۷)

لائحہ عمل

اسلامی تحریکوں کے قائدین کو ان تمام داخلی اور خارجی خطرات اور اندیشوں کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی طے کرنا چاہیے تاکہ منزل کی طرف سفر کامیابی کے مراحل سے گزرے۔ اسلامی تحریکوں کو اس بات کا مکمل اور واضح شعور ہونا چاہیے کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ اس لیے کہ مکمل آگہی اور شعور ہی مقاصد کو حاصل کرنے کے وسائل اور ذرائع کا تعین کرتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے مقاصد اور اہداف اس وقت تک حاصل نہ ہوسکیں گے جب تک کہ دعوتی قوت اور حکومتی اقتدار دونوں ان کے ہاتھوں میں نہ ہوں۔ مقاصد و اہداف کے تعیّن کے بعد ضروری ہے کہ ترجیحات کو متعین کرلیا جائے اور انھیں زندگی کے تمام گوشوں میں نافذ کرنے میں تدریج کا خیال رکھا جائے اور افراط وتفریط سے بچا جائے۔

کتاب وسنت کی پیروی

اسلامی تحریکوں کو اپنے اساسی مرجع کا تعیّن کرتے ہوئے اپنے احکامات وتعلیمات کو اسی سے اخذ کرنے اور اپنی تہذیب وتمدن کو اسی بنیاد پر استوار کرنے کا اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ نیز اختلاف کی صورت میں وہی مرجع ہونا چاہیے۔ بلاشبہہ بحیثیت امت ہمارا مرجع 'دین اسلام' ہے جس سے

مراد کسی خاص زمانے، کسی خاص ملک یا کسی خاص مسلک کا اسلام نہیں اور نہ کسی خاص مکتبِ فکر کا ہی اسلام ہے، بلکہ دورِاولین کا وہ اسلام ہے جو ہر قسم کی بدعات اور ملاوٹ سے پاک تھا۔ یعنی فرقوں میں بٹ جانے سے پہلے کا وہ صحیح اسلام، جو تاویلات وتشریحات کی بھول بھلیوں میں کھو جانے سے پہلے کے دورِ نبویؐ اور خیر القرون کا اسلام ہے۔ حقیقی اسلام کو متعارف کروانے اور دنیا میں نافذ کرنے کے لیے مشترکہ طور پر ایسا نظام مرتب کرنے اور جاری وساری کرنے کے لیے ایسی عالمی مشینری کو وجود میں لانا ہوگا جو افراط وتفریط سے پاک ہو کر متوازن اور معتدل تعلیمات پر عمل کرے۔

یہ تحریک عالمی تبلیغ میں اصول یسر (آسانی) کو پیش نظر رکھنے والی، انسانی مسائل کا حل پیش کرنے میں سہولت کے پہلو کو مقدم کرنے والی اور عام فہم ہونی چاہیے۔ اسی طرح دوسرے فریقوں سے ربط وضبط رکھنے، ان کی سننے اور اپنی کہنے کی قائل ہو۔ مخالفت کرنے والوں کے ساتھ وسعت قلبی کے ساتھ معاملہ کرسکتی ہو۔

ہمہ گیر تعاون کا حصول

سنگین خطرات اور فی الوقت محدود امکانات کے پیش نظر محض اسلامی تحریکوں کے مختلف گروہوں کے درمیان تعاون ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص یا گروہ سے تعاون ضروری ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں کچھ بھی کام انجام دے رہا ہو۔

ضروری ہے کہ اسلامی تحریکیں تمام انسانوں کو اپنے حق میں ہموار کریں۔ غیرمسلموں کو اسلام کی دعوت دیں اور ان کے سامنے اسلام کا کمال وجمال اس طور پر پیش کریں کہ وہ اسلام کو پسند کریں اور قبول کرلیں۔ مسلمانوں کی دینی تعلیمات کے ذریعے تذکیر کریں، ان کے اندر ایمان وخیر کے خفتہ جذبات کو اس طرح اُبھارا جائے کہ وہ دین کو پہچان لیں اور اس کی پیروی کرنے لگ جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان، تحریک اسلامی کا ہدف ہیں۔ اسے اس بات کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ لوگ اس دین کے دوست بن جائیں اور بلاشبہہ دوست بنانا دشمن بنانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مسلم سماج میں ان وسائل کو تلاش کرنا چاہیے جو اسلامی دعوت کے لیے دوست بنانے کا ذریعہ بنیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس میں ناکامی تباہ کن ہے اور دین کے مصالح کے لیے مضرت رساں ہے۔ دوست بنانے کے لیے اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام مسلمانوں سے حسن ظن رکھیں۔ معاملہ کرتے وقت غلط فہمی یا حقارت کا رویہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہے کہ تمام مسلمانوں میں خیر کا پہلو غالب ہے اور ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ ہے، جسے وہ دین کے لیے پیش کر سکتا ہے اور ایک شخص کے بارے میں ہماری منفی سوچیں غلط ہو سکتی ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا اسلامی اخوت کا تقاضا ہے۔ لوگوں کے دلوں تک پہنچنے کا بہترین طریقہ اصحاب فضل کا اعتراف اور ان کی اچھی باتوں کی تعریف کرنا ہے۔ اگر ہم ایک شخص کے اچھے پہلوؤں کی ہمت افزائی کریں گے تو گویا اس کا دل جیت لیں گے، یا کم از کم اس کے تنقیدی رویے میں کمی آجائے گی۔

حکمت اور دعوت

تحریکات اسلامی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ایسے بہت سے امور و مسائل بھی ہیں جن میں فوری یکسوئی ضروری ہوگئی ہے مثلاً اسلامی تحریکات سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ معاشرے میں اچھائیوں کے فروغ اور برائیوں کی روک تھام کے کسی موقع کو ضائع نہیں کریں گی اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے میں کوتاہی نہیں کریں گی۔ اسلامی تحریکوں کی عملی کوششیں انسانوں کے عملی رویے کو اسلامی قدروں کے مطابق ڈھالنے اور ان مقاصد کا خادم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یہی طریق کار تحریک اسلامی کو عصر جدید کی ان سیکولر تحریکوں سے ممتاز کرتا ہے جو ابتدا ہی سے اپنا مرکز توجہ سماج کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلی کو بناتی ہیں اور انسان کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتیں۔ یہی طریق اختیار کر کے ان ملکوں میں بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جن کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمان نہیں ہے۔ اس غیر مسلم غالب اکثریت کے دل و دماغ کو نفرت اور بے زاری کے زہر سے پاک کر کے ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے حسنِ ظن پیدا کیا جاسکتا ہے، تاکہ وہ دعوت اسلامی پر کھلے دل و دماغ سے غور کر سکیں لیکن یہ طریقِ کار اختیار کرنے کے لیے پیغمبرانہ وسیع النظری اور عالی حوصلگی کی ضرورت ہے۔

وحدت امت

امت کے جسد پر ایک اور گہرا زخم "افتراق و اختلاف امت" ہے۔ اس کا علاج وحدت امت اسلامیہ کے نسخۂ کیمیا سے ہی ممکن ہے کیونکہ کٹی پھٹی اور بکھری ہوئی امت کا کوئی مستقبل نہیں۔ اُمت واحدہ اب مختلف اقوام کا مجموعہ بن چکی ہے، الگ الگ گروہوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ یہ گروہ محض متفرق مجموعے ہی نہیں، بلکہ عملاً ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، خود ہی ایک دوسرے کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں جب کہ موجودہ دور میں مختلف الخیال اقوام پرانے اختلافات، نسلی امتیازات، مذہبی لڑائیاں اور علاقائی جھگڑے کم سے کم کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ مشترکہ مصلحتوں کی خاطر کش مکش کے ایام مسترد کر کے مختلف اتحاد اور مشترکہ منڈیاں وجود میں لائی جارہی ہیں یہاں تک کہ ان کے باہم شیر و شکر ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اسلامی تحریکیں اس وقت تک مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی عالمی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ نہیں کرسکتیں جب تک مسلمانوں کو متحد و متفق کرنے میں کامیاب نہ ہوجائیں۔ یہ ممکن نہیں کہ مسلمان خود کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم رکھیں اور آج کی دنیا کے بڑوں سے ٹکر بھی لے سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پوری کی پوری امت مسلمہ مشترکہ ہدف پر متحد و متفق ہو۔

نیا عالمی منصوبہ

اسلامی تحریکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا عالمی منصوبہ تشکیل دیں جس پر عمل پیرا ہوکر پس ماندگی کی حالت کو بدلا جاسکے، ترقی اور سبقت لے جانے کی فضا پیدا ہوسکے۔ مسلمان بلاشرکت غیرے ایک ہزار سال تک دنیا کی قیادت کرتے رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن ساری دنیا میں رائج تھی۔ مسلمانوں نے ساری دنیا کے لوگوں کو آدابِ حیات سکھائے تھے۔ اسلامی تحریکیں یہ حقیقت واضح کرنے میں بنیادی کردار ادا کرسکتی ہیں کہ جہالت و پس ماندگی ہماری سرشت کا حصّہ نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کی موجودہ حالت اسلام کے مزاج سے میل کھاتی ہے۔

مسلمان عوام کی ناخواندگی، جہالت اور مسلم ممالک کی معاشی پس ماندگی دور کرنے کا سوال اس لیے اہمیّت اختیار کرگیا ہے کہ ایک طرف تو موجودہ صورت حال خود ان تحریکوں کے پیغام کو سمجھنے اور قبول کرنے میں رکاوٹ ہے اور دوسری طرف یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر عوام ان تحریکوں

کی دعوت قبول کرلیں، تب بھی اصل صورت حال کو بدلے بغیر مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام قائم کرنا دشوار ہے۔ عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے غلبے اور اسلامی دنیا کے بارے میں ان کے جارحانہ عزائم اور ان عزائم کی تکمیل میں پستی کی ہر حد سے گزر جانے والے ایجنٹوں کا وجود ایک ایسا چیلنج ہے جس کے مقابلے کے لیے بھرپور طاقت ناگزیر ہے۔ اس طاقت کی فراہمی کے لیے تعلیم، بالخصوص سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست پیش رفت اور بڑے پیمانے پر صنعتی عمل ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو اس سوال کا عملی جواب دینا اور ان پہلوؤں کو اپنی دعوت اور نظام اصلاح و تربیت میں خصوصی مقام دینا ہوگا۔ نیز اسی سے یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اسلامی ممالک میں حکمرانوں اور اسلامی تحریکوں کا باہمی ٹکراؤ کس حد تک ناگزیر ہے۔ اس امر پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جس حد تک یہ ٹکراؤ عالمی سطح پر اسلام دشمن استعماری قوتوں کی ریشہ دوانیوں اور ذہنی غلبے کا نتیجہ ہے، اس حد تک اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صحیح حکمت عملی کیا ہے؟ کیا یہ زیادہ مفید نہ ہوگا کہ یہ لڑائی اپنے اصل محاذ پر لڑی جائے اور دشمن کی اس سازش کو ناکام بنا دیا جائے کہ ہمارے اپنے گھروں کے اندر باہم تصادم اور سرپھٹول کا شکار ہو جائیں۔

اسلامی انقلاب کی حکمت عملی کے اس پہلو پر بھی بحث کی بہت گنجایش ہے کہ حقوق آزادی کی خاطر اور مسلم یا غیر مسلم استبداد کے مقابلے کے لیے ہتھیار اٹھانے کی افادیت اور جواز کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اس امر پر متفق ہو جائیں کہ طاقت کا استعمال صرف اسی وقت درست ہے جب اسلام کی سرزمین پر غیر ملکی حملہ آور ہو جائیں۔ برعظیم پاک و ہند میں سید مودودی کی اسلامی فکر کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ باقاعدہ اعلان شدہ جہاد کے علاوہ اسلحے کے استعمال کے ناقابل قبول ہونے کا مسئلہ طے ہو گیا ہے۔ اس سے علاقہ باہمی جنگ و جدل سے محفوظ ہو گیا ہے جب کہ عالم عرب میں یہ بات طے نہ ہونے کی وجہ سے کئی تباہ کن واقعات رونما ہوئے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حکومتوں سے بہت سی قانونی تبدیلیوں کے مطالبے کو اولیت حاصل ہونی چاہیے یا کچھ اور کاموں کو، کیونکہ عصر حاضر میں اصل مسئلہ متعین اور معلوم اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہے۔ یہ کام خود ایک بڑے کام کا جزو ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی میں عدل و انصاف، آزادی و مساوات، عفت و پاک بازی، سکون خاطر اور طمانیت قلب کے وہ

مقاصد کس طرح حاصل کیے جائیں جن کے لیے یہ قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ان کے حصول کے جہاں قانونی اصلاحات ضروری ہیں، وہیں انسانوں کے خیالات وافکار ،مزاج و رجحان اور حوصلوں میں تبدیلیاں بھی ناگزیر ہیں۔

عالمی صیہونی تحریک کا مقابلہ

امت مسلمہ کے لیے ممکن نہیں کہ تہذیب وتمدن کی بلندیوں کو چھو لے جب تک کہ وہ اپنے وجود کے خلاف ہونے والی عالمی صہیونی سازش کا مقابلہ کرتے ہوئے، اسے شکست فاش نہ دے دے۔اسی طرح نصرانیت اور ہندومت کی سازشوں کو سمجھنا اوران کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دینا بھی ضروری ہے۔یہ ہدف زبانی دعوؤں اورامن وسلامتی کے نام پر کیے جانے والے ان معاہدوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا جن کا واضح مقصدان قوتوں کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینا ہے بلکہ اس کے لیے بصیرت افروز پختہ سوچ اور گہرے ایمانی جذبات ضروری ہیں۔ امت مسلمہ کے احیا کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوامی سطح پر اور حکومتی و عسکری سطح پر نئے عزم وحوصلے سے پختہ بنیادوں پر کام کا آغاز کیا جائے۔وہ طرزِ فکر وعمل اپنایا جائے جس سے ہر مسلمان نفسیاتی ،فکری اور تہذیبی و تمدنی حوالوں سے اپنا سر بلند کر کے چل سکے۔

صہیونی ریاست کا نعرہ ہے کہ:''اے اسرائیل تیری سرحدیں دریاے فرات سے لے کر نیل تک ہیں'' اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ'' چاول کے کھیتوں سے کھجور کے جھنڈوں تک''۔یہود نے اس خیالی نعرے کو پے در پے کوششوں سے اپنے حامیوں کے دلوں میں راسخ کر دیا ہے۔اس کے مقابلے میں ہمارے دینی لٹریچر میں یہ سچّی بشارتیں موجود ہیں کہ اسلام عالم گیر کامیابی حاصل کرے گا، ساری دنیا میں اس کا ڈنکا بجے گا۔ ہماری تاریخ بھی شان دار اور سچّے عالم گیر حقائق پر مبنی ہے۔ اس لیے بجا طور پر مستقبل میں مزید کامیابیوں اورسرفرازیوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ حقائق مسلمان نسلوں کے دل و دماغ میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمہ جہت ترقی کے لیے جدوجہد

اسلامی تحریکوں کو جس ہدف کو خاص اہمیّت دینی چاہیے اور جس کے حصول کے لیے ہر دم

کمربستہ رہنا چاہیے، وہ اسلامی معاشرے کی ہمہ جہت مجموعی ترقی کا حصول ہے۔اس کے لیے بھر پور اور دور رس منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ انسانی وسائل کو انسانی ترقی کے لیے سرگرم کیے بغیر یہ ہدف حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسان ہی اس ہدف کا اصل محور ہے اور انسان ہی اس کے حصول کا ذریعہ بھی۔ موجودہ وسائل کو بہترین انداز سے استعمال کرتے ہوئے ترقی کی منازل کو طے کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہمہ جہت ترقی مسلمانوں کی اقتصادی ترقی، پیداواری ترقی اور پیداوار کے متوازن استعمال اور معاشرے میں اس کی منصفانہ تقسیم، لوٹ کھسوٹ اور ملاوٹ وبدعنوانی کو ترک کرنے ہی سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو امت مسلمہ اقتصادی دباؤ سے نکل آئے گی۔

امت مسلمہ کے پاس ثروتوں کے لامحدود خزانے موجود ہیں۔ یہ خزانے امت کے میدانوں اور پہاڑوں میں، اس کی وادیوں اور صحراؤں میں، اس کے سمندروں اور دریاؤں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہماری جغرافیائی اہمیّت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے اور انسانی وسائل بھی وافر ہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہم ان بیش بہا قیمتی خزانوں کا صحیح استعمال جان جائیں اور انھیں درست انداز سے زیرتصرف لاکر مجاہدانہ انداز سے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔ پھر اس طرح زندگی بسر کریں جس طرح ہم چاہتے ہوں نہ کہ اس طرح جییں جس طرح ہمارے دشمن چاہتے ہیں۔

منصفانہ سیاسی نظام کا قیام

اس کی اہمیّت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا اہداف اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتے جب تک اسلامی تحریکیں منصفانہ سیاسی نظام رائج کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کرلیتیں۔ وہ نظام جس سے تمام شہریوں کو ان کے صحیح حقوق مل جائیں، جو انسان کے مقام ومرتبے اور آزادیِ رائے کا احترام کرنے کا ضامن اور انسانی جان ومال وعزت کا رکھوالا ہو۔ یہ ایسا نظام ہو جس سے روحِ شورائیت بیدار ہو اور خیرخواہی اور ذمہ داری کا جذبہ پروان چڑھے۔ یہ نظام اسلام کے شرعی طرزِ سیاست پر مبنی ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد امت اسلامیہ کی نشاَتِ ثانیہ ہو۔ یہ نظام جبر واستبداد کے نمایندہ حکمرانوں اور سازشی ٹولوں کا دفاع کرنے والا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ عوام کے مفادات کو پیشِ نظر رکھنے والا ہو، جس کے تحت اللہ کے قانون کو کسی تفریق کے بغیر سب پر یکساں

نافذ کیا جائے، جس میں اعلیٰ وادنیٰ کا فرق روا نہ رکھا جائے اور نہ ہی کسی سے امتیازی سلوک برتا جائے۔

جدید وسائل کا استعمال

ہر زمانے کی اپنی خصوصیات اور تقاضے ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ دوسرے زمانے سے ممتاز ہوتا ہے۔ موجودہ اسلامی تحریکیں ایسے زمانے میں ابھری ہیں جس میں انسانی علوم نے بہت ترقی کی ہے۔ ملکوں کے فاصلے گھٹ گئے ہیں۔ وسائل اور ذرائع کے تنوع اور کثرت کی وجہ سے تہذیبوں کا اختلاط ہو گیا ہے۔ ساری دنیا سکڑ کر ایک گاؤں کی طرح ہو گئی ہے۔ اسی طرح آج کے دور میں جو نئے افکار و نظریات اور انسانی سلوک اور رویوں میں جدتیں پیدا ہوئی ہیں، ان سے پہلے کے لوگ آگاہ نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام دنیا کے تمام گوشوں میں پھیل چکا ہے اور اس کے ماننے والے اپنے تربیتی پس منظر، فکری ورثہ اور زندگی کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں۔

ان ساری باتوں نے اسلامی تحریکوں کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کے نئے بوجھ ڈال دیے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اسلامی تحریکیں، اسلامی فکر اور تہذیب کی تشکیل میں، دعوتی کام کے طریقوں میں اور لوگوں سے معاملہ اور تعلق قائم کرنے کے سلسلے میں نیا انداز اختیار کریں۔ نئی اور مفید چیزوں سے جو کہ خلاف شرع نہ ہوں بھرپور استفادہ کریں۔ اسلامی بیداری کو کسی تنگ گھاٹی میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ ذرائع ابلاغ (کتب، رسائل، اخبارات، کمپیوٹر سی ڈیز، ریڈیو، ٹیلی ویژن) کا بائیکاٹ محض اس دلیل پر کہ میڈیا میں ایسے مواد ہوتے ہیں جو اخلاق کے لیے تباہ کن ہیں، نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح اندازِ فکر یہ ہے کہ ہم ان وسائل کو مسلم سماج کے خیر اور نفع کے لیے استعمال کریں۔

خواتین کا مقام

اسلامی تحریکوں میں عورت کی شمولیت اور عملی دل چسپی بھی ضروری ہے۔ عورتیں معاشرے کا نصف حصہ ہیں اور وہی نئی نسلوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ مسلم ممالک کے خلاف فکری یلغار کا ایک خصوصی ہدف مسلمان عورت بھی ہے۔ مغربیت کے داعی مسلم معاشرے میں عورت اور آزادیِ نسواں کے مسئلے کو اسلام کے خلاف اپنی جنگ کا اہم حصہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ فکری یلغار کے سارے تیروں کا رخ مسلم عورت کی طرف ہے۔ یہ تیر فیشن،

زیب و زینت اور تبرج الجاہلیہ کے ہیں جو بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ عورت کی آزادی اور حقوق کے نام پر پھینکے جا رہے ہیں۔ بعض غیر اسلامی نظریات کے علَم برداروں کا طریقۂ واردات یہ بھی ہے کہ انھوں نے عورتوں کے مسائل کو اس انداز میں چھیڑا ہے کہ بس وہی عورتوں کے حقوق کے حقیقی محافظ اور چیمپئن ہیں۔ ان کوششوں سے بہت سی عورتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ بے شک بہت سی خرابیاں اور ناانصافیاں مسلم معاشرے میں جڑ پکڑ چکی ہیں جن کی وجہ سے عورتوں میں احساس محرومی پایا جاتا ہے۔ ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد کو چاہیے کہ عورتوں پر خصوصی توجہ دیں، انھیں شریعت کے عطا کردہ تمام حقوق کی ادایگی کا اہتمام کریں، شرعی حدود کے اندر انھیں تعلیم، طب اور علوم کے میدان میں صلاحیتیں استعمال کرنے کا موقع دیں۔

بیداری ، اُمت کی ضرورت

ان اہداف کے حصول کے لیے سب سے پہلے اسلامی تحریکوں کو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی سوچ اور فکر کو بلند کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ بلند اہداف کا تعین اور امید کی فضا تیار کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے دورِ حاضر کے مسلمان کی تہذیبی، اخلاقی اور نفسیاتی تربیت اور انسان مطلوب کے اعلیٰ معیار پر ایسے افراد تیار کرنا ہوں گے جو ہوائے نفس کی غلامی سے آزاد ہوں، جو علاقائیت سے سحر زدہ نہ ہوں، جنھیں شر کی چکاچوند دھوکا نہ دے سکے۔ وہ پیش آمدہ مشکلات سے پریشان نہ ہوں، بلکہ ان پر قابو پانے اور حق و سچ پر پامردی سے ڈٹ جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ان تمام اداروں کو باہم مل کر فضا تیار کرنی ہوگی جو تربیت انسان میں موثر کردار رکھتے ہوں، تاکہ اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان، اسلام کے سچے پیغام اور آخرت کے دائمی گھر، سب کی آبیاری ہو سکے۔ اسلامی تحریکوں کو ایسے ایمان کے لیے کوششیں کرنی ہوں گی جس سے بہترین و مثبت عملی ثمرات ظاہر ہوں۔ اعلیٰ اخلاقیات جنم لیں اور بندگیِ رب، تعمیر دنیا اور بنی نوع انسان کے فائدے کی صورت سامنے آسکے۔

اسلامی تحریکات کا مستقبل

تحریکاتِ اسلامی نے اپنا جو دور پورا کرلیا ہے، اس نے عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں

کو بہت کچھ دیا ہے۔ دین کی جامعیت کا شعور اور اجتماعی زندگی میں دین کی تعلیمات سے روگردانی کا ابطال، اسلام کے موزونیت اور صالحیت پر اعتماد، اس کی طرف رجوع اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا عزم آج کسی مخصوص جماعت یا حلقے تک محدود نہیں، بلکہ پورے مسلمان معاشرے میں عام ہو چکا ہے۔ سیاسی نظم و اتحاد اور اقتصادی صلاحیت کے اعتبار سے بھی آج اسلامی دنیا وہاں نہیں جہاں اس صدی کے آغاز میں تھی۔ ان روشن پہلوؤں کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام کی تفہیم و ترجمانی کا کام اس حد تک انجام پا چکا ہے کہ اب بجز ضد اور ہٹ دھرمی، تعصب اور مفاد پرستی اور جبر وتشدد کے، اسلام کے قبول عام اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یا یہ کہ ہمارے عوام اسلام چاہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ابھی فکری اور عملی سطح پر بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اسلامی تحریکات کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور عصر حاضر میں اسلامی تعمیر نو کے تقاضوں کو پہچان کر انھیں پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ بات بھی فیصلہ کن ہوگی کہ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ نے تحریک کے فرد اور لائحہ عمل میں جن نقائص اور کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے، ان کو پہچاننے اور دُور کرنے میں تحریک کی نئی قیادت کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ نئی قیادت بانیانِ تحریک کی مقلد محض ثابت ہوتی ہے، یا انھی کی طرح اجتہادی فکر سے کام لیتی ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کی نگاہیں اپنے ماضی ہی کی طرف رہتی ہیں اور وہ اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہیں یا معاصر حالات کے تجزیے اور مستقبل کے بارے میں مبنی بر بصیرت اندازوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرتی ہیں۔ تحریکات کے لیے ایک راہ، راہِ جمود ہے، دوسری اقدام و اجتہاد کی۔ یہی دوسرا راستہ کامیابی کا ضامن ہوسکتا ہے۔

یہ رنگ بھری دنیا

ہارون یحییٰ / ترجمہ: گلناز کوثر

زمین جس پر ہم مقیم ہیں اور وسیع کائنات جس میں یہ زمین واقع ہے، ان دونوں کے درمیان بے پناہ ہم آہنگی موجود ہے، حتیٰ کہ صرف کھڑکی سے باہر دیکھنے پر ہی ہم اس ہم آہنگی کی بہت سی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ بادلوں، آسمان، درختوں، پھولوں، جانوروں اور اسی طرح کی ملتی جلتی مثالوں میں کامل تنظیم اور تناسب ظاہر ہوتے ہیں۔

جب ہم فطرت کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہر جانور اور ہر پودے کے اپنے مخصوص رنگ اور نقوش ہیں جو ان کی قسم سے خاص طور پر منسوب ہیں۔ مزید برآں ان میں سے ہر رنگ اور ہر شکل جان دار اشیا کے لیے مختلف معنی رکھتی ہے۔ ساتھی کے لیے دعوت، غصّے کا اظہار، خطرے کے خلاف تنبیہہ اور اسی طرح کے بہت سے اشارات، ان جانوروں کی شکلوں کو سمجھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

نظریۂ ارتقا جس کا دعویٰ ہے کہ ہر شے اتفاقی حادثے کے نتیجے میں وجود میں آ گئی ہے، فطرت میں موجود فن کاری، نیرنگی اور تناسب کی وجہ سے، ایک بند گلی میں پہنچ گیا ہے۔ چارلس ڈارون جو اس نظریے کا بانی ہے اور جس نے اسے موجودہ حالت تک پہنچایا ہے، جان دار اشیا کی ساخت کی بدولت اسے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

ڈارون نے کہا کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ جان دار مخلوقات کے رنگ مخصوص معنی کے حامل کیوں ہیں؟ میری مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھار مکوڑے ایسے خوب صورت اور فن کارانہ رنگوں کے کیوں ہوتے ہیں؟ یہ دیکھ کر ان میں سے بہت سوں کے رنگ خطرے سے بچاؤ کے لیے ہوتے ہیں،

میں ان شوخ رنگوں کو دوسری صورتوں میں محض طبعی حالات کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ نر تتلیاں اور مکوڑے اس قدر خوب صورت کیوں ہوتے ہیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں مگر مجھے اپنی راے پر قائم رہنا چاہیے۔

ایک بار پھر چارلس ڈارون اپنے ہی نظریے میں موجود تضاد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں روشن رنگ نر مچھلیوں اور مادہ تتلیوں کی قدر کرتا ہوں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک جنس کی خوب صورتی کی قیمت دوسری کو نہیں دینا پڑتی۔ اس معاملے میں مجھے نہیں لگتا کہ فطری انتخاب کے عمل سے یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ ایک جنس کی خوب صورتی دوسری کی وجہ سے متاثر ہوئی''۔

یقیناً فطرت میں موجود رنگوں، تنظیم اور تناسب کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ فطری انتخاب کے ذریعے وجود میں آجائیں۔ اس موقع پر یہ مفید ہوگا کہ فطری انتخاب کے تصور کا ایک نزدیکی جائزہ لے لیا جائے جسے ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے جنم دیا ہے۔ جیسا کہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، فطری انتخاب نظریۂ ارتقا کا ایک تصوراتی نظامِ عمل ہے۔ اس کے مطابق وقت کے ساتھ اپنے ماحول میں موزوں ترین جان دار باقی رہ جاتے ہیں، جب کہ کمزور اور اپنے ماحول کی شرائط کے لیے ناموزوں جان دار ختم ہوجاتے ہیں۔ ارتقا پسندوں کے دعووں کے مطابق ایک نسل کے ارکان میں ایک مفید تبدیلی اس کے جینز میں ہونے والے بے ترتیب تغیر کے ذریعے آتی ہے۔ یہ مخلوق باقی تمام نسلوں میں سے موزوں ترین ہونے کے باعث بقا کے لیے منتخب کرلی جاتی ہے اور اس طرح جو کچھ کہ محض ایک بے ترتیب تغیر کا نتیجہ تھا، وہ سب بڑی مقدار میں اگلی نسلوں میں منتقل ہوجاتا ہے۔

جان داروں کے رنگوں اور اشکال میں موجود تناسب کے لیے یقیناً ممکن نہیں ہے کہ اس نظامِ عمل کے ذریعے وہ تخلیق پاجائیں۔ یہ بے حد واضح حقیقت ہے۔ اگرچہ وہ اس نظریے کا بانی ہے، پھر بھی ڈارون کو خود بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ فطری انتخاب کا تصوراتی نظامِ عمل ایسی تنظیم کا باعث نہیں بن سکتا۔ جے ہاکز (J. Hawkes) بھی نیویارک ٹائمز میگزین اپنے آرٹیکل Nine Tantalizing Mysteries of Nature میں فطری انتخاب کی بے معنویت پر شک کا اظہار یہ کہتے ہوئے کرتا ہے کہ اسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ پرندوں، مچھلیوں، پھولوں وغیرہ کی خیرہ کن خوب صورتی فطری انتخاب کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ اس سے

ہٹ کر وہ یہ سوال پوچھتا ہے کہ کیا انسانی شعور اس طرح کے نظامِ عمل کی پیداوار ہوسکتا ہے؟ اپنے مقالے میں آخر کار وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسانی دماغ جس نے تہذیب جیسی نعمت پیدا کی ہے اور جو ایک تخلیقی ذہن رکھتا ہے جس کی وجہ سے سقراط، لیونارڈو، شیکسپیئر، نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے لوگ غیر فانی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، ہمارے لیے جنگل کے اس قانون کا تحفہ نہیں ہوسکتا جسے جہد للبقا (struggle for survival) کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ارتقا پسندوں کے ان اعترافات سے یہ سمجھا ہے کہ انھیں معلوم ہے کہ ان کا نظریہ تضادات کا شکار ہے۔ اس تصور کا دفاع کرنا نامعقول بات ہے کہ ایک خلیہ جو فرض کیا اچانک بجلی اور بارش کے نتیجے میں زمین پر وجود میں آجاتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ رنگین جان دار مخلوق میں تبدیل ہوجائے گا۔ فرض کرو ایک سائنس دان ایک خلیہ مثال کے طور پر بیکٹیریم (becterium) لیتا ہے۔ اسے تجربہ گاہ میں مناسب ترین ماحول مہیا کرتا ہے، تمام آلات جو درکار ہوں استعمال کرتا ہے، لاکھوں سالوں تک اس خلیے کے ارتقا پا جانے پر محنت کرتا ہے (گو کہ یہ فرض کرنا بھی ممکن نہیں) آخر کار کیا حاصل ہوگا؟ کیا وہ اس بیکٹیریم کو کبھی خیرہ کن رنگوں والے مور میں تبدیل کر سکے گا، یا ایک کامل نقوش والی جلد کے حامل تیندوے میں یا پھر اپنی مخملیں پتیوں سمیت ایک گلاب میں؟ یقیناً ذہین لوگ اس طرح کی چیزوں کے متعلق تصورات نہیں پالتے اور نہ ایسے دعوے ہی کرتے پھرتے ہیں اگرچہ یہ نظریۂ ارتقا کے دعوے کے عین مطابق ہے۔

نظریۂ ارتقا میں رنگوں کی پیچیدگی

آؤ اس بات کی تصدیق ایک مثال کے ذریعے کرتے ہیں کہ جان داروں کے رنگوں کی تخلیق اور تبدیلی کا امکان بذریعۂ فطری انتخاب ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر گرگٹ کو لیتے ہیں۔ گرگٹ ایسے جانور ہیں جو ماحول میں موجود رنگوں کو قبول کرتے ہوئے اپنے رنگوں کو گرد و پیش کے رنگوں کے مطابق تبدیل کر لیتے ہیں۔ سبز پتوں پر آرام کرتے ہوئے وہ سبز رنگت اختیار کر لیتے ہیں، بھوری شاخ پر چلتے ہوئے تھوڑی سی دیر میں ان کی رنگت بھوری ہوجاتی ہے۔ آؤ مل کر سوچیں رنگ کی تبدیلی کا یہ عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ایک جان دار مخلوق اپنے جسم میں ہونے والے بے حد پیچیدہ عمل کے نتیجے میں اپنا رنگ تبدیل کرتی ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنا یا کسی دوسری جان دار مخلوق کا رنگ تبدیل کرے کیونکہ انسانی جسم اس طرح کے عمل کے لیے مطلوبہ نظام سے لیس نہیں ہے۔ نہ انسان کے لیے یہ ممکن ہی ہے کہ وہ اپنے آپ ایک ایسا نظام اختیار کر لے کیونکہ یہ کوئی ہتھیار نہیں ہے جسے گھڑ کر جسم پر سجا لیا جائے۔ مختصراً ایک زندہ مخلوق کے لیے اپنا رنگ تبدیل کرنے کے قابل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس مخلوق میں اس رنگ کی تبدیلی کے لیے نظامِ عمل موجود ہو۔

آیئے زمین پر پہلی گرگٹ کے بارے میں غور کریں۔ کیا ہوتا اگر اس مخلوق کے پاس رنگ بدلنے کی صلاحیت نہ ہوتی؟ سب سے پہلے تو یہ کہ اس کے لیے چھپنا ممکن نہ رہتا اور اس کے سبب یہ آسانی سے شکار ہو جاتی۔ دوسری طرف آسانی سے پہچانے جانے کے باعث اس کے لیے شکار کرنا بے حد مشکل ہو جاتا اور آخرکار ان وجوہات کی بنا پر کسی قسم کے دفاعی نظام سے عاری گرگٹ بھوک اور موت کا شکار ہو جاتی اور کچھ عرصے میں معدوم ہو جاتی۔ اس کے باوجود آج دنیا میں گرگٹ کا وجود اس ثبوت کی شہادت ہے کہ اس کے ساتھ اس طرز کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ لہٰذا یہ زمین پر نمودار ہونے والے پہلے لمحے سے اسی کامل نظام کی مالک ہے۔

ارتقا پسندوں کا دعویٰ ہے کہ گرگٹ نے اس نظام کو وقت کے ساتھ ساتھ اپنایا ہے۔ اس سے ہمارے دماغوں میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ گرگٹ نے بجائے کسی آسان نظامِ عمل کے رنگ بدلنے جیسے پیچیدہ نظام ہی کو کیوں اپنایا؟ اس نے رنگ کی تبدیلی کا انتخاب کیوں کیا، جب کہ بہت سے دفاعی نظام موجود تھے؟ کس طرح سے گرگٹ میں رنگ کی تبدیلی کے لیے تمام تر ضروری کیمیائی عمل مہیا کرنے والا نظامِ عمل تشکیل پایا؟ کیا ایک ریپٹائل کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے کسی نظامِ عمل کے بارے میں سوچے اور پھر اپنے جسم میں ضروری نظامات پیدا کرے؟ مزید یہ کہ کیا ایک ریپٹائل کے لیے یہ ممکن ہے کہ رنگ کی تبدیلی کے لیے ضروری معلومات کو خلیوں میں موجود ڈی این اے میں ایک کوڈ کی صورت ڈال دے؟

بے شک یہ ناممکن ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب میں نکالے جانے والا نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلتا ہے کہ جان دار مخلوق کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ایسا پیچیدہ نظام پیدا کر لے جس کے ذریعے

خود اپنا رنگ تبدیل کر سکے۔

جان داروں میں نہ صرف تبدیلیِ رنگ کا نظام بلکہ رنگوں اور نقوش کا تنوع بھی قابلِ غور ہے۔ طوطوں کے شوخ اور مچھلیوں کے متنوع رنگ، تتلیوں کے پروں کے تناسب، پھولوں کے سحر انگیز نقوش اور دیگر جان داروں کے رنگوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ خود ہی تشکیل پا جائیں۔ ایسے کامل نقوش، رنگ اور اجسام جو جان داروں کی زندگی میں نہایت اہم مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں، تخلیق کی پختہ شہادت ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ہمارے گرد رنگوں کی تشکیل میں ایک ارفع ارادہ موجود ہے۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتے ہیں: فرض کریں ہم چوکور خانوں پر مشتمل کوئی چیز بنا رہے ہیں۔ ان میں سے حتیٰ کہ ایک کو بھی بنانے کے لیے ہمیں تھوڑا حساب کتاب سے کام لینا پڑتا ہے کہ چاروں کونے پتلے اور برابر ہوں اور چوکور اپنے کناروں پر ۹۰ درجے کا زاویہ رکھتا ہو۔ ہم اس چوکور کو کچھ حساب کتاب اور طریقے ہی سے بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ایک چوکور کو بنانے میں بھی کچھ علم اور مہارت درکار ہے۔

آیئے اسی منطق کو جان دار مخلوقات پر لاگو کریں اور ان پر غور کریں۔ جان داروں میں ایک کامل تناسب، تنظیم اور منصوبہ بندی موجود ہے۔ ایک انسان جو ایک سادہ چوکور کو بنانے میں درکار علم اور مہارت کی ضرورت کو سمجھتا ہے، وہ یہ فوراً سمجھ لے گا کہ کائنات کی تنظیم، تناسب، رنگ اور نقوش بھی ایک لامحدود علم اور مہارت کی پیداوار ہیں۔ اس لیے اس دعوے کے لیے کوئی سائنسی یا معقول بنیاد موجود نہیں ہے کہ کائنات جیسا نظام اتفاقاً وجود میں آ گیا ہے۔ اللہ قادرِ مطلق نے تمام کائنات کو تخلیق کیا ہے، اللہ واحد ہے جو اپنی تخلیق کی ہوئی ہر شے کو خوب صورت ترین انداز میں مزین کرتا ہے۔

یہ فطری تناسب اتفاقیہ نہیں

کائنات میں موجود ہم آہنگی کی نمایاں ترین مثال تناسب ہے۔ جان دار اشیا اپنی ساخت میں ایک تناسب رکھتی ہیں۔ فطرت میں نظر آنے والی کسی بھی چیز جیسے ایک بیج، پھل یا پتے کا بغور جائزہ لینے پر ہمیں اس میں ایک تناسب نظر آتا ہے۔ پتے پودے کے جسم کے ساتھ کمانی دار انداز میں جڑے ہوتے ہیں۔ یہ مخصوص طرز کا تناسب ہے۔ اسی طرح ایک قابلِ مشاہدہ تنظیم بیج کے اندر موجود دانوں اور پتے کی رگوں کے نقوش میں نظر آتی ہے۔

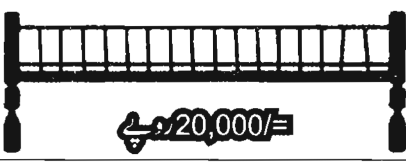
فطرت میں موجود تتلی کے پر تناسب کی ایک اور مثال ہیں۔ تتلی کے دونوں پروں پر ایک سے رنگوں کے شیڈز اور نقوش ہوتے ہیں۔ ایک پَر پر موجود نقوش عین اسی طرح اسی مقام پر دوسرے پَر پہ بھی موجود ہوتے ہیں۔

ہم اپنے اردگرد اور بہت سی مثالیں دیکھ سکتے ہیں جن میں سے کچھ کا خلاصہ ہم نے اُوپر پیش کیا ہے۔ بہرحال اہم بات یہ ہے کہ ان تمام مثالوں سے ایک مشترکہ نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک بے مثال تنظیم یا زیادہ درست انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک عظیم الشان فن کاری جان دار اشیا میں نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ایسے نفیس نظام اور فن کاری سمیت یہ کائنات کسی بھی طور اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتی۔ پروفیسر کیمل یلدرم (Cemal Yildirim) اگرچہ وہ خود ایک ارتقا پسند ہے، اپنی کتاب Theory of Evolution and Bigotry میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے: ''اس بات پر قائل ہو جانا بے حد بعید از امکان ہے کہ جان دار اشیا کی اس تنظیم کو جو کسی خاص مقصد کی حامل نظر آتی ہے، کسی اتفاق یا حادثے سے منسوب کر دیا جائے''۔

اللہ نے کائنات میں ہر شے کو ایک بڑی تنظیم میں پرویا ہے۔ اللہ کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے:

> تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، اُس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ (اس حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں، اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں (البقرہ ۲: ۱۶۳-۱۶۴)۔ (انتخاب: یہ رنگ بھری دنیا، ناشر: ادارہ اسلامیات، انارکلی، لاہور)





ترکی: سیکولرزم کا ایک اور حملہ

عبدالغفار عزیز

ترکی کے سیاسی نظام پر نگاہ دوڑائیں تو دو حقیقتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اتاترک نے وہاں ایک ایسا ظالمانہ نظام ورثے میں چھوڑا ہے جس میں اسلام پسند قوتوں کے سامنے ہر دروازہ بند کردیا گیا ہے، اور دوسری اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ ترکی کی تاریخ میں جب بھی اس نظام کے بل بوتے پر اسلامی قوتوں کا راستہ روکا گیا وہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئیں۔ ترکی کے حالیہ واقعات نے ایک بار پھر اسی عمل اور ردعمل کی مضبوط بنیاد رکھ دی ہے۔

آج سے ۱۰۰ برس قبل ۱۹۰۸ء میں عثمانی خلافت کی آخری مضبوط نشانی سلطان عبدالحمید کا اقتدار ختم کیا گیا اور آج سے ۸۵ سال پہلے اپریل ۱۹۲۳ء میں کمال اتاترک اور اس کی جمہوری پیپلز پارٹی کا اقتدار شروع ہوگیا۔ ۱۹۳۸ء میں اتاترک تو آں جہانی ہوگیا لیکن اس کی پارٹی ۱۹۴۶ء تک اکلوتی حکمران رہی۔ اتاترک کی موت سے ایک سال قبل ۱۹۳۷ء تک ترکی کا دستور یہی کہتا تھا کہ ''ترکی کا سرکاری مذہب اسلام ہے'' لیکن پھر جامع ترامیم کرتے ہوئے دستور کی شق ۲ میں لکھ دیا گیا کہ ''ترکی ایک سیکولر ریاست ہے''، اور یہ شق ناقابلِ تبدیل ہے۔ اتاترک نے اذان و نماز سے لے کر تلاوتِ قرآن تک اور انفرادی لباس و انداز سے لے کر ریاستی نظام و احکام تک ہر چیز سے اسلام کی روح و شناخت کو بے دخل کردیا۔ اتاترک کے ہوتے ہوئے نہ کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت تھی اور نہ اس کی پارٹی کے مقابلے میں کوئی اور جماعت ہی تشکیل دینے کی۔ ایک بار اس کے

ذاتی دوست فتحی اوقیار نے آزاد جمہوری پارٹی کے نام سے الگ جماعت تشکیل دی تو اتاترک مخالف عناصر اس میں جمع ہونے لگے۔ جلد ہی یہ جماعت کالعدم قرار دے دی گئی۔

اتاترک کے بعد عصمت اینونو حکمران بنا، تھا تو وہ بھی سیکولر لیکن وہ جان چکا تھا کہ ترکی میں یک جماعتی نظام اب مزید نہیں چل سکتا، اس نے بعض اپوزیشن رہنماؤں کو پارٹی بنانے کی اجازت دے دی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے نئی جماعت بنی اور اس نے کچھ ہی عرصے کے بعد ہونے والے انتخابات میں ۴۶ نشستیں حاصل کرلیں۔ ۱۹۵۰ء میں اگلے انتخاب ہوئے تو اس نوتشکیل شدہ جماعت نے میدان مارلیا۔ اتاترک کی پیپلز پارٹی کو نہ صرف اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا بلکہ ایک ایک کر کے ان اسلامی مظاہر کو بھی بحال ہوتے دیکھنے کا عذاب سہنا پڑا جنھیں اتاترک نے بڑے جبروغرور سے ختم کیا تھا۔ سالہا سال کی پابندی کے بعد مساجد کے میناروں سے عربی میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تو ترک دیوانہ وار سڑکوں پر ہی سجدہ ریز ہوگئے۔ پھر قرآن کریم کی تلاوت دوبارہ سے ہونے لگی۔ دینی تعلیم کے ادارے کھل گئے اور فوج میں بھی دینی تعلیم کا احیا ہوگیا۔

ترکی کے جدید سیاسی نظام میں اس بات کا سختی سے اہتمام کیا گیا تھا کہ فوج کی سرپرستی اور سیاسی جماعتوں کے قانون کا لٹھ استعمال کرتے ہوئے ہر اسلام پسند طاقت کا راستہ روک دیا جائے۔ اسلامی عناصر کسی صورت مجتمع ہو بھی جائیں تو وہ ایک چھوٹی جماعت سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کرسکیں۔ پہلے تو یہ اسلامی عناصر مختلف سیاسی جماعتوں کے حصے کے طور پر کام کرتے رہے لیکن ۱۹۶۹ء کے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر نجم الدین اربکان نے ملّی نظام پارٹی کے نام سے ایک مستقل' بالذات پارٹی بنانے کا اعلان کردیا۔ دستوری پابندی کے باعث انھوں نے اپنے اسلامی ہونے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن سب جانتے تھے کہ ان کی اصل شناخت کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگ اس پارٹی کی طرف متوجہ ہوتے ۱۹۷۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔ نجم الدین اربکان نے ملّی سلامت پارٹی کے نام سے نئی جماعت تشکیل دینے کا اعلان کردیا۔ ملّی سلامت پارٹی نے کئی دیگر جماعتوں سے اتحاد کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانا شروع کیے ہی تھے کہ ۱۹۸۰ء میں ایک اور فوجی انقلاب کے ذریعے اس پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں، اربکان نے رفاہ پارٹی تشکیل دے دی اور احتیاط و کامیابی سے سیاسی سفر طے کرتے ہوئے ۹۰ کی دہائی

میں بلدیاتی اداروں میں شان دار کامیابی حاصل کی۔ بلدیاتی اداروں کی کارکردگی کی بنیاد پر ۱۹۹۵ء میں رفاہ پارٹی نے پارلیمانی انتخابات میں بھی شان دار کامیابی حاصل کرلی اور ۱۹۹۶ء میں اربکان مخلوط حکومت کے سربراہ منتخب ہوگئے۔ حکومت کا ایک برس بھی پورا نہیں کیا تھا کہ سیکولرزم کی محافظ ہونے کی دعوے دار فوج نے دستوری عدالت کے ذریعے ان کی حکومت ختم اور پارٹی غیرقانونی قرار دے دی۔

کسی جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئے بغیر اربکان نے فضیلت پارٹی تشکیل دے دی۔ رفاہ پر پابندی سے تین ماہ قبل ڈاکٹر اربکان سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی تب فضا میں پابندی کا ارتعاش محسوس کیا جاسکتا تھا، انھوں نے کہا کہ رفاہ کے ہر دفتر پر ہمارے نام کا مخفف آر پی لکھا ہوا ہے۔ ہمیں معمولی سی تبدیلی کرنا پڑے گی اور یہی دفاتر ایف پی، یعنی فضیلت پارٹی کے مراکز بن جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا لیکن جلد ہی فضیلت کو بھی رفاہ کا تسلسل قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اربکان اور ان کے ساتھیوں نے سعادت پارٹی بنانے کا اعلان کردیا۔ اس موقع پر عبداللہ گل، طیب اردوگان اور ان کے ساتھیوں نے اپنی علیحدہ اور وسیع تر عوامی نمایندگی کی حامل 'انصاف و ترقی پارٹی' (جس کے ترکی نام کا مخفف اے کے پی ہے) بنانے کا اعلان کردیا۔ ہر اسلام پسند کو اس تقسیم پر تشویش ہوئی لیکن ترک عوام کی اکثریت یہی سمجھی کہ یہ تقسیم حکمت عملی ہی کا حصہ ہے، بار بار پابندیوں کی تلوار سے بچنے کے لیے 'استاذ' نے خود ہی اپنے 'شاگردوں' کو علیحدہ ہونے کا اشارہ کیا ہے۔

نومبر ۲۰۰۲ء میں انتخابات ہوئے تو اے کے پی نے تمام سیاسی پارٹیوں کو تاریخی شکست دے دی۔ طیب اردوگان اور عبداللہ گل کی بنیادی شناخت محنتی، امین اور باصلاحیت قیادت کی ہے۔ گذشتہ پارلیمانی سیشن کے دوران انھوں نے اپنے نام کے دونوں حصوں انصاف و ترقی کی لاج رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے کرپشن کے دروازے بند کرتے ہوئے پورے معاشی نظام کا ڈھانچا تبدیل کردیا۔ افراطِ زر کا تناسب ۶۵ اور ۷۰ فی صد سے کم کر کے ۹ فی صد تک پہنچا دیا۔ سود کا تناسب ۱۰۵ فی صد سے کم کر کے ۱۹ فی صد تک لے آئے، بیرونی قرضے ۲۳ ارب ڈالر سے کم کر کے ۹ ارب ڈالر تک لے آئے۔ ترکی کی برآمدات ۳۶ ارب ڈالر سے بڑھ کر ۹۵ ارب ڈالر تک جا پہنچیں، فی کس آمدنی ۲۵۰۰ ڈالر سے بڑھ کر ۵۵۰۰ ڈالر فی کس ہوگئی، غریب خاندانوں کے لیے

۲ لاکھ ۸۰ ہزار گھر بنوا کر انتہائی آسان قسطوں پر دے دیے، سردی کے موسم میں غریب خاندانوں میں ہر سال ۱۵ لاکھ ٹن کوئلہ مفت تقسیم کیا۔ اتاترک کے مسلط ہونے کے بعد سے لے کر اب تک ترکی میں ۴۵۰۰ کلومیٹر لمبی سڑکیں بنی تھیں۔ اے کے پی نے صرف اپنے پہلے دورِ اقتدار میں ۶۵۰۰ کلومیٹر لمبی سڑکیں تعمیر کروا دیں۔ ان اقتصادی و تعمیراتی فتوحات کی فہرست طویل ہے اور جو منصوبے ابھی زیرِ تکمیل ہیں ان کی فہرست اور بھی طویل۔ اس کارکردگی کی بنیاد پر گذشتہ سال ہونے والے عام انتخابات میں انصاف و ترقی کو ۴۷ فی صد، یعنی ایک کروڑ ۶۵ لاکھ (۱۶٫۵ ملین) ووٹ حاصل ہوئے۔ بعدازاں صدارتی انتخابات میں بھی تمام تر کوششوں کے باوجود عبداللہ گل کا راستہ نہ روکا جاسکا اور اس طرح ملکی نظام کے پانچ ارکان میں سے تین (پارلیمنٹ، وزارتِ عظمیٰ اور صدارت) انصاف و ترقی کے ہاتھ میں آ گئے۔ سیکولرزم کے محافظ دو خطرناک کیمپ (فوج اور دستوری عدالت) اب بھی اس کے سر پر لٹکتی ہوئی ایک خوں خوار تلوار ہیں۔

مارچ میں ترک پارلیمنٹ نے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں طالبات کے حجاب پر عائد پابندی ختم کر دی، اور وہ بھی ان محفوظ الفاظ میں کہ آیندہ ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کی طالبات پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی جائے گی جس کا ذکر دستور میں نہیں ملتا۔ یہ ترمیم اتنا بڑا جرم ٹھیری کہ سابق 'حقیر کارکردگی' اس کے سامنے ہیچ ٹھیری۔ ترک سیکولرزم کو سنگین خطرات لاحق ہوگئے اور اٹارنی جنرل نے ملک کی اعلیٰ دستوری عدالت میں منتخب حکومت اور صدر و وزیراعظم سمیت اس کے ۷۱ ذمہ داران کو اپنے اپنے عہدوں کے لیے نااہل قرار دینے کا مطالبہ کر دیا، ۴۷ فی صد عوام کی حمایت یافتہ 'انصاف و ترقی پارٹی' کو غیرقانونی قرار دینے کی اپیل کر دی۔ حالانکہ دستور کے مطابق صدر کا مواخذہ صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ دستور سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہو اور یہ مواخذہ بھی پارلیمنٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

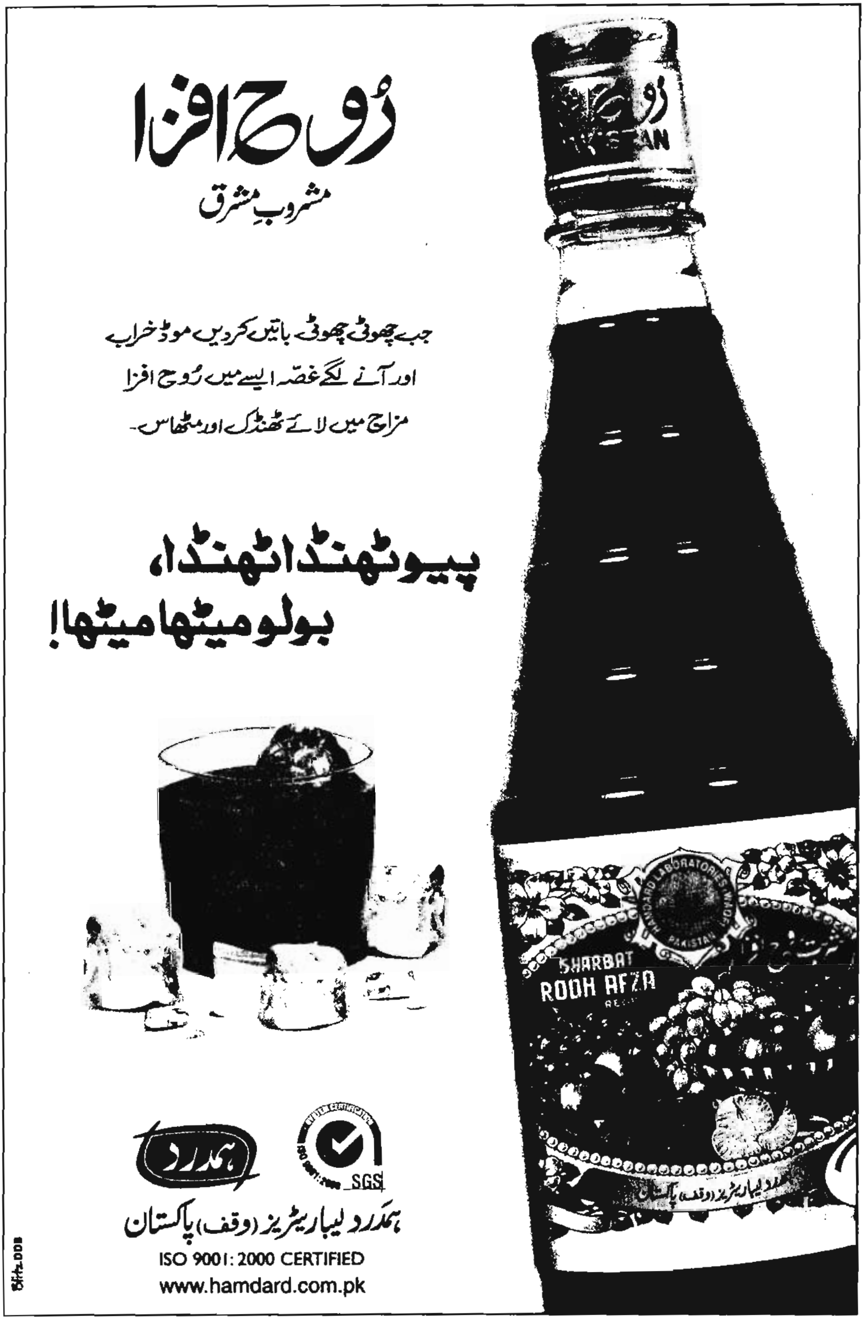
۳۱ مارچ کو دستوری عدالت نے اس اپیل کو سماعت کے لیے قبول کرلیا اور صدر عبداللہ گل کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے پارٹی کو دو ماہ کے اندر اندر اپنا جواب جمع کرنے کا حکم دیا۔ پارٹی پر پابندی لگانے کی اپیل کو سماعت کے لیے قبول کرلینا ہی اتنا بڑا سیاسی زلزلہ ہے کہ ہر شخص حیرت زدہ رہ گیا۔ اسٹاک مارکیٹ اور کرنسی کا نرخ متاثر ہونا تو فطری بات تھی، پورا سیاسی نقشہ ہی تلپٹ ہونے کا خدشہ

لاحق ہوگیا۔

وزیراعظم رجب طیب اردوگان نے عوام کو بہرصورت صبروتحمل سے کام لینے کی اپیل کی ہے۔حکمران پارٹی کے سامنے کئی راستے کھلے ہیں۔ایک تو تصادم اور ایسا عوامی دباؤ کہ جو دستوری عدالت اور فوج کو پسپائی پر مجبور کردے، تجزیہ نگاروں کی اکثریت اس امکان کو مسترد کر رہی ہے۔ دوسرا راستہ دستوری ہے اور وہ یہ کہ دستور میں ترمیم کرتے ہوئے دستوری عدالت سے سیاسی جماعتوں پر پابندی کا اختیار ہی چھین لیا جائے۔ عدالت کو اٹارنی جنرل کی اپیل کے خلاف یا حق میں فیصلہ دینے کے لیے ۱۱ میں سے ۷ ججوں کا اتفاق راے چاہیے۔ان ۱۱ میں سے کئی جج سال کے آخر میں ریٹائر ہوجائیں گے اور ان کی جگہ نئے ججوں کا تعین خود صدرمملکت عبداللہ گل کریں گے،یعنی اگر دورانِ سال عدالت کسی وجہ سے اس سماعت کو مکمل نہ کرسکی تو عدالت کا اپنا ڈھانچا تبدیل ہوجائے گا۔ عدالت کے سامنے ایک بڑی رکاوٹ ترکی کا یورپی یونین میں شمولیت کا خواب بھی ہے۔

ان تمام رکاوٹوں اور دستوری ترامیم کے امکانات کے باوجود ترک تجزیہ نگار خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اٹارنی جنرل کی اپیل اور عدالت کا اسے سماعت کے لیے قبول کرلینا ہی واضح اشارہ ہے کہ فوج ان کوششوں کی پشت پر ہے اور اب حکمران پارٹی کو پابندی کا شکار ہونے سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ یہی تجزیہ نگار اس امر پر بھی متفق ہیں کہ اگر ایسا ہوگیا تو 'انصاف وترقی' کی جگہ لینے کے لیے ایک نئی پارٹی کی تشکیل چند ہفتوں یا چند دنوں کی بات ہوگی اور دنیا ایک بار پھر اس تاریخی حقیقت کا اعادہ دیکھے گی کہ جب بھی پابندی لگی نئی پارٹی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ میدان میں آئی۔اے کے پی نہ رہی تو نئی پارٹی دوتہائی اکثریت کے حصول اور مزید وسیع تر سیاسی صف بندی کا عملی مظاہرہ کرے گی، تب تک دستوری عدالت اور فوجی جرنیلوں کے پُلوں کے نیچے سے بھی بہت سا پانی بہہ چکا ہوگا۔ گویا کہ نام نہاد سیکولرزم کے نام نہاد محافظ اپنے ہی کھودے گڑھے کا شکار ہوچکے ہوں گے۔

وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۝ (ابراہیم ۱۴:۲۰) اللہ کے لیے ایسا کرنا بالکل بھی دشوار نہیں۔


روح افزا
مشروبِ مشرق
جب چھوٹی چھوٹی باتیں کردیں موڈ خراب
اور آنے لگے غصہ ایسے میں روح افزا
مزاج میں لائے ٹھنڈک اور مٹھاس۔
پیو ٹھنڈا ٹھنڈا،
بولو میٹھا میٹھا!
SHARBAT
ROOH AFZA
HAMDARD LABORATORIES (WAQF)
PAKISTAN
ہمدرد
SGS
ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
ISO 9001: 2000 CERTIFIED
www.hamdard.com.pk

مسلمان اور مغرب: مقابلہ اور مکالمہ

پروفیسر عبدالقدیر سلیم ٥

اسلام اور مغرب، مسلمان اور مغربی دنیا، یہ موضوع آج کل عالمِ اسلام میں بھی اسی طرح گرما گرم بحث کا موضوع ہیں، جس طرح مغربی دنیا میں۔ اخبارات، رسائل و جرائد، کتابوں اور برقیاتی ذرائعِ ابلاغ میں مختلف زاویوں سے ہونے والی گفتگو دل چسپ بھی ہوتی ہے، اور بعض اوقات اُکتا دینے والی بھی۔ پیشِ نظر کتاب، جو دو معروف اہلِ علم کی مُرتبہ ہے، مشرق اور مغرب کے ۱۲ دانش وروں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اپنے کلیدی (اور تفصیلی) مقالے میں اسماعیل ابراہیم نواب نے مسلمانوں کے مغرب کے ساتھ تعلقات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ عیسائیت سے اسلام کی مڈبھیڑ (encounter) ساتویں صدی عیسوی میں عیسائی شام پر مسلمانوں کے غلبے ہی سے شروع ہوگئی تھی، اور اسے عیسائیوں کی اکثریت نے خوش دلی سے قبول بھی کیا تھا، کیوں کہ مسلمانوں نے مذہبی رواداری اور حُریت فکر کا مظاہرہ کیا تھا، تاہم اُس زمانے میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ یوحنا دمشقی نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں پر وہ فکری یلغار شروع کی جو آج بھی جاری ہے، اور ہمارے عہد کے غالباً ممتاز ترین مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی اس میں شامل ہیں'' (ص ۹)۔ مقالہ نگار نے بڑی محنت سے ماضی اور حال میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان خوش گوار (اور ناخوش گوار) تعلقات کا جائزہ لینے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب آپس میں پُرامن بقاے باہمی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ (ص ۵۰)

---

٥ پروفیسر، کومکس انسٹی ٹیوٹ آف ایمرجنگ سائنسز اینڈ بزنس ایجوکیشن، کراچی

عبدالرحیم قدوائی نے انگریزی ادب میں اسلام اور مسلمانوں کی صورت گری کا جائزہ لیا ہے۔ حسین مطالب کے بقول مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے درمیان تعصبات اور غلط فہمیاں ہیں۔ مغرب میں اسلام کے منفی ادراک کو جنم دینے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلوں، مغرب کے استعمار اور مسلم علاقوں پر اس کے سیاسی غلبے، مغربی ذرائع ابلاغ کا غیر متوازن رویّہ (مسلمانوں کو عموماً انتہا پسند دہشت گردوں کے رُوپ میں پیش کرنا)، مسلمانوں اور غیرمسلموں کی ایک دوسرے کے عقائد سے لاعلمی اور عالمی تناظر سے بے خبری، اور خود مسلمانوں اور اُن کے قائدین کی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں خامی اور کوتاہیاں اس کی ذمہ دار ہیں۔

اہلِ مغرب اور مسلمان، خود اپنا اپنا ادراک کس طرح کرتے ہیں؟ اس پر ترکی کے احمد داؤد اوغلو کا مقالہ بڑا معلوماتی ہے۔ ۲۰ویں صدی کے اوائل میں ترکی کی مقتدرہ نے خود کو مشرف بہ مغرب کرنے کی پوری جدوجہد کی، مگر یورپ نے اِسے دل سے قبول نہ کیا۔ بات یہ ہے کہ 'انسانِ اسلامی' (Homo Islamicus) اپنے بنیادی ادراکات و مزعومات (کائنات، زمان و مکاں، تعلقاتِ انسانی و خداوندی کے بارے میں اپنے تصورات) میں 'انسانِ مغربی' (Homo Occidentalis) سے بالکل مختلف ہے، تاہم وہ یہ مشورہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے کہ مغرب اپنے اس ادراک پر نظرثانی کرے، اور اسلامی تہذیب کے علَم بردار بھی خود کو 'رجعت پسندی' کی خود بینی سے آزاد کریں۔ یہ دونوں کی صحت کے لیے مفید ہوگا۔

خالد مسعود نے اُن ناموں کا جائزہ لیا ہے جن سے مسلمانوں اور اہلِ یورپ نے ایک دوسرے کو یاد کیا ہے۔ 'Hagarea' —— ہاجرہؑ کی اولاد (جنھیں ہمارے عیسائی بھائی حضرت ابراہیمؑ کی 'لونڈی' قرار دیتے ہیں)، 'Saracens' کی اصل بھی شاید کچھ اسی طرح کی تھی، مگر یورپ میں اس کے معنی کافر، مشرک، بدعقیدہ لیے گئے۔ 'Moor' کی اصل غالباً ایک یونانی لفظ ہے، جس کے مفہوم میں سیاہ فام، نابینا اور تاریک شامل ہیں۔ 'Mussulman' اور اس سے ملتے جلتے الفاظ 'Mussul-Woman' مرد اور عورت کے لیے استعمال کیے گئے۔ 'Mohammadan' (مختلف حروف اور ہجوں کے ساتھ، نیز اس طرح کے دوسرے الفاظ)، اُمت محمدیہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے استعمال کیے گئے۔ مسلمانوں کی زبانوں میں اہلِ مغرب کے لیے افرنجی، فرنگ،

ولایتی جیسے الفاظ استعمال کیے گئے جو کم از کم تحقیر سے تو مبرا ہیں۔

جین اسمتھ نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عیسائی مشنریوں کے مزعومات اور خیالات کا جائزہ لیا ہے، جو ابتداءً جتنے جارحانہ تھے، اتنے ہی جاہلانہ بھی۔ شروع میں خیال تھا کہ عیسائی یلغار کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات مدھم پڑتی جائیں گی، مگر ایسا نہ ہوا۔ اگرچہ آج بھی کہیں کہیں [عیسائی مبلغوں کے] وہ پرانے حوالے نظر آتے ہیں، جن میں رسول [اللہ صلی اللہ علیہ] کو [نعوذ باللہ] شیطان کے ساتھی کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، لیکن آج کے عیسائی مبلغ اسلام کو ایک مبنی برحق اور دُرست مذہب کے طور پر دیکھنے کے لیے کھلا ذہن رکھتے ہیں"۔ اور اِن دو مذاہب کے درمیان اشتراک اور تعاون کی بات بھی کرتے ہیں۔

مغرب میں 'ناپسندیدہ' مسلمانوں کے لیے 'بنیاد پرست' (fundamentalist) کی اصطلاح عام ہوچکی ہے۔ یونی ایزبک حدّاد کے نزدیک یہ تصور داہنے بازو کے دانش وروں (سیکولر اور مذہبی)، مصنفین، صحافیوں، صہیونیوں نیز اُن تمام عرب اور 'اسلامی' حکومتوں کے لیے بھی عام ہوچکا ہے، جو امریکی امداد کی طرف نظریں جمائے رکھتی ہیں۔ اسرائیل کے وزیراعظم اسحاق رابین (Itzhak Rabin) کہتے ہیں: "ہمارا واحد دشمن اسلام ہے"۔ اور ڈیوڈ بن گوریان (سابق وزیراعظم اسرائیل) اور اسرائیلی ریڈیو کے مطابق: "اسلامی اسپرٹ کی بازیافت، اس علاقے میں اسرائیل کے مستقبل اور مغربی تہذیب کے مستقبل کے لیے خطرہ ہے۔ یہودی جانتے ہیں کہ اسلام اُن کے وجود کے لیے خطرہ ہے، مسلمان کب یہ بات سمجھیں گے؟" (ص ۲۹۰-۲۹۱)

مگر مسلمان نہ اپنے اِس 'دشمن' کی بات سمجھتے ہیں، نہ اپنے دوست یوسف القرضاوی (جامعہ قطر میں ڈائرکٹر ریسرچ اور معروف عالم) کی، جن کے نزدیک: "اسلام اپنی تمام ہمہ گیریت، کُلیت اور توازن کے باوصف، اِس تمام علاقے سے غائب ہے، وہ اپنے وطن میں اجنبی بن چکا ہے۔ ریاستی معاملات، چاہے وہ سیاسی ہوں، معاشی یا دوسرے داخلی اور خارجی علائق، ان سب میں عوامی زندگی سے اُسے بے دخل کیا جاچکا ہے۔ [مغرب نے] یہ فیصلہ کردیا ہے کہ اسلام، عیسائیت کے عہدِ زوال کا ایک چربہ بن جائے ___ یعنی قانون سازی کی قوت سے تہی دست، محض ایک مجموعۂ عقائد، عبادات کی ایک ظاہری صورت جو عملاً معاملات سے خالی ہو۔ ایک ایسا مذہب، جس

کی کوئی ریاست حاکمہ نہ ہو، ایک قرآن، بلاسُلطان (بے اختیار)''۔ (ص ۲۹۵)

سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں 'اسلام پسند' مسلمانوں کی کیا راے ہے؟ سید ولی رضا نصر 'ریاستیں اور اسلامیانے کا عمل' کے عنوان سے کہتے ہیں کہ گذشتہ دو دہائیوں سے اسلامی تحریکیں، سیاسی میدان میں بڑی اہمیت اختیار کرچکی ہیں، اور اس کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں اسلام کی طرف رجوع کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ ولی رضا، ریاست کے اسلامیانے کے عمل کی تین مثالوں، پاکستان، ملایشیا اور ایران میں تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس طرح عوام کی زندگی اور معاشرے میں ریاست کا عمل دخل (جبر!) اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ضیاء الحق، مہاتیر محمد اور 'اسلامی ایران' کے کارپردازوں نے لادینیت اور مغرب کے استرداد کے نام پر ایک طرح کی آمریت کو فروغ دیا۔ بہت سی 'اسلام پسند' نیز سیکولر حکومتوں نے بھی دینی مدارس اور اسلامی مراکز پر حکومتی کنٹرول کی کوشش کی ہے، لیکن دینی حلقوں کی طرف سے اس طرح کی کوششوں کی مزاحمت ہورہی ہے۔ پاکستان، ملایشیا، ترکی، مصر اور بہت سے اسلامی ممالک میں یہ کش مکش جاری ہے۔

مگر اس کش مکش میں غالب آنے والی قوت بظاہر تو مغرب ہی کی ہے، بقول مراد ہوف مین (Murad Hofmann): ''یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ مغربی ثقافت ایک لازمی عالمی ثقافت بن جائے، اور وہی دوسری تمام ثقافتوں کی صورت گری کرے۔ سیول سے سوہوتک، مستقبل کا انسان جینز پہنے گا، برگر کھائے گا، کوکا کولا پیے گا، مارلبورو سگریٹ کے کش لگائے گا، انگریزی بولے گا، سی این این دیکھے گا اور ایک جمہوری ریاست میں باہاس [جرمن فنِ تعمیر] طرز کے مکان میں رہایش پذیر ہوگا، اور غالباً رسمی طور پر کسی عیسائی چرچ کا رُکن بھی ہوگا''۔ (ص ۲۶۲)

مگر کیا واقعی ایسا ہوگا؟ یا صورت حال کچھ تبدیل ہورہی ہے؟

فضیاتی ترقیوں کی آزاد رسائی سے دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں اب صورتِ حال اتنی سادہ نہیں رہ گئی ہے۔ مغربی ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ (نقلِ مکانی، تبدیلیِ مذہب، اور شاید بہتر شرحِ پیدایش)۔ بعض مقتدر مغربی حلقوں میں 'اسلام آرہا ہے! اسلام آرہا ہے'، 'اسلام کا عروج، مغرب پر چھا جائے گا' اور 'ایک مقدس جنگ اب ہمارے سامنے ہے' اور اس طرح کے نعرے گونج رہے ہیں۔

اسٹیون ایمرسن (Steven Emerson) کے خیال میں تو امریکا میں سارے ہی اسلامی بنیاد پرست، ممکنہ دہشت گرد ہیں۔ وہ مغرب کی ہیئت حاکمہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ایف بی آئی کو چاہیے کہ مسلمانوں کی مساجد، اسلامی اداروں، اُن کی مجالس اور محفلوں میں نفوذ کرے۔(ص ۲۶۴)

یہ بات واضح ہے کہ لامذہب مغرب اپنی 'ترقی' بہتر کارکردگی، بڑھوتری (growth)، پیمانۂ کبیر پر پیداوار اور صَرف کے لیے مجنونانہ جذبے کی دوڑ میں اتنا مشغول ہے کہ اُس کے پاس اسلام کے تصورِ آخرت پر زور، سماجی انصاف کے فلسفے، عبادات کے شعور اور رُوحانی اور دنیاوی مطلوبات کے درمیان ایک متوازن معاشرے کی تشکیل کی فکر پر دھیان دینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہم اگر کسی 'مغربی انسان' کے ہاتھ میں قرآن مجید کا کوئی نسخہ، ترجمہ یا تفسیر تھما دیں تو شاید وہ اپنی اچھی سی کوشش کے باوجود اُسے سمجھ نہ پائے گا۔ مظفر اقبال تجویز کرتے ہیں کہ ہمیں مغرب میں ___ اور اسلامی دنیا میں بھی ___ ایسے ادارے تشکیل دینے چاہییں، جن میں علمائے دین، طبعی اور سماجی علوم کے ماہرین، انسانی علوم میں گہری بصیرت رکھنے والے، کمپیوٹر کے سائنس دان، معمار، فن کار اور اطلاعاتی فنیات کے ماہر جمع ہوں، اور یہ ادارے ایسے ماہرین اور علما منصۂ شہود پر لائیں، جو مغرب اور اسلامی دنیا میں متنازعہ اُمور کو سلیقے سے سلجھانے کی کوشش کریں۔ اسی طرح آیندہ کے امکانی تصادم کا سدّ باب ہو سکے گا___ کیسی اچھی خواہش ہے یہ!

(*Muslims and The West: Encounter and Dialogue* [مسلمان اور مغرب: مقابلہ اور مکالمہ]، مرتبہ: ظفر اسحاق انصاری و جان ایل ایسپوزیٹو، شائع کردہ: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ صفحات: ۳۵۲، قیمت: ۳۰۰ روپے)

اخبارِ اُمت

مصر میں بلدیاتی انتخابات کا ڈھونگ

حافظ محمد ادریس ○

مصر عالمِ عرب کا بہت اہم ملک ہے۔ عالمِ اسلام کی مضبوط تحریک اسلامی، اخوان المسلمون اس ملک میں ۱۹۲۸ء میں وجود پذیر ہوئی۔ اپنے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد اس تحریک کو گوناگوں مشکلات اور مصری حکومت کے تشدد کے علاوہ عالمی قوتوں کی چیرہ دستیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تحریک کی بنیادیں قرآن وسنت کے مضبوط اور محکم اصولوں پر اٹھائی گئی تھیں، اس لیے تحریک کی قیادت اور کارکنان نے وقت کے طوفانوں کا ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دوست اس پر جھوم اٹھتے ہیں تو دشمن بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حسن البنا شہید ہوں یا ان کے قافلے کے دیگر شہدا، عبدالقادر عودہؒ، محمد فرغلیؒ اور سید قطبؒ سبھی آج دنیا میں روشن ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ تحریک کی قیادت میں حسن الہضیبیؒ سے لے کر عمر تلمسانیؒ تک اور مصطفیٰ مشہورؒ سے لے کر محمد مہدی عاکف حفظہ اللہ تک سبھی صاحبِ عزیمت تھے۔ قید و بند کی صعوبتیں اور ظلم وستم کے کوڑے ان کے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔

اخوان قانون اور دستور کے مطابق تبدیلی کے علَم بردار اور خفیہ سرگرمیوں کے مخالف ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ عدالتوں میں اپنے کیس لڑے مگر بدقسمتی سے مصری حکمرانوں نے کبھی عدالتوں کو آزادانہ فیصلے کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جب جرأت مند قاضیوں نے جان جوکھوں

○ ڈائرکٹر ادارہ معارف اسلامی، لاہور

میں ڈال کر انصاف پر مبنی فیصلے صادر کیے تو پاکستانی حکمران جنرل پرویز مشرف کی طرح مصری حکمرانوں کا کوڑا عدلیہ پر بھی برستا رہا۔ عدالتوں کے ججوں کا ضمیر اس کے باوجود زندہ ہے، اسی وجہ سے بیش تر مقدمات عسکری عدالتوں ہی میں چلائے جاتے ہیں۔ اخوان اپنے آغاز ہی سے سیاسی اور جمہوری دھارے میں شامل رہے ہیں لیکن مصری نظام نے انھیں کبھی قبول نہیں کیا۔ مصر کے گذشتہ عام انتخابات منعقدہ ۲۰۰۵ء میں اخوان سے متعلّق امیدواروں نے اپنی آزادانہ حیثیت میں ساری دھاندلیوں کے باوجود ۸۸ نشستوں پر کامیابی حاصل کر کے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ملک کے عام انتخابات کے بعد شیڈول کے مطابق بلدیاتی انتخابات کا انعقاد اپریل ۲۰۰۶ء میں ہونا تھا مگر مصری حکومت نے مختلف حیلوں بہانوں سے وہ انتخابات دو سال کے لیے ملتوی کر دیے۔ اس التوا پر ملک بھر میں شدید احتجاج ہوا، اور مصر کی سول سوسائٹی نے کئی دنوں تک اس مسئلے کو حکومت کی بوکھلاہٹ اور بزدلی قرار دے کر بلدیاتی انتخابات منعقد کرانے کی تحریک جاری رکھی۔

اس موقع پر تمام تجزیہ نگار کہہ رہے تھے کہ مصری حکومت اخوان کی مقبولیت سے خوف زدہ ہوکر بلدیاتی انتخابات سے راہِ فرار اختیار کرگئی ہے۔ اس دوران حسنی مبارک نے دستور میں کئی ترمیمات کیں، جنھیں حکمران پارٹی کے انگوٹھا چھاپ قانون سازوں نے منظور کرلیا مگر سول سوسائٹی نے ان پر ہمیشہ تحفظات کا اظہار بلکہ شدید مخالفت اور احتجاج کیا۔ ان دو سالوں میں مصر میں پھر سے پکڑ دھکڑ کا ایسا سلسلہ شروع ہوا، جس نے جمال عبدالناصر کے فرعونی دور کی یادیں تازہ کر دیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اخوان جیلوں میں ڈالے گئے، حتیٰ کہ ان کے ارکان پارلیمنٹ کو بھی نہ بخشا گیا۔ ظلم کی حد یہ ہے کہ اگر اخوانی اسیروں کے اہلِ خانہ کی دیکھ بھال اور معاشی مدد کے لیے کوئی صاحبِ خیر خدمت سرانجام دیتا تو اس جرم کی پاداش میں اسے بھی جیل میں ڈال دیا جاتا۔ ایسے تمام کیس خصوصی ملٹری عدالتوں میں چلائے جاتے ہیں۔ اخوان کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر محمود عزت کے بقول: ایک ایسے مخیّر مصری کو جس نے اسیروں کے بال بچوں سے تعاون کیا، ۵۵ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ (بحوالہ رسالہ الاخوان، شمارہ ۵۴۷، ۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء)

۲۰۰۸ء کے آغاز میں انھی پُرآشوب حالات میں حسنی مبارک حکومت نے ملک بھر میں

بلدیاتی انتخابات کا اعلان کردیا۔ستم ظریفی دیکھیے کہ ان انتخابات سے قبل اخوان کے اہم رہنماؤں کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا اور انتخابات کا اعلان ہوتے ہی ملک بھر سے اخوان کے متوقع بلدیاتی امیدواروں کی پکڑ دھکڑ بھی شروع ہوگئی۔ ۸ اپریل انتخابات کی تاریخ تھی، جب کہ اس سے قبل اخوان کے ڈیڑھ سے دو ہزار کے درمیان مقامی رہنما ملک بھر کی جیلوں میں محبوس کر دیے گئے۔ تجزیہ نگاروں کے بقول حال ہی میں کی جانے والی دستوری ترمیم جس کے مطابق صدارتی امیدوار کے لیے ۹۰ ارکانِ پارلیمان اور ۱۴۰ بلدیاتی اداروں کے سربراہوں کی تائید ضروری ہے، اس پکڑ دھکڑ کی اصل محرک ہے۔ حسنی مبارک خوف زدہ ہے کہ کہیں اپوزیشن کا کوئی نمایاں لیڈر آیندہ انتخابات میں صدارتی امیدوار کے لیے اہلیّت حاصل نہ کرلے۔

اخوان نے ان انتخابات کے لیے ۵ ہزار ۷سو ۵۴ امیدواروں کا انتخاب کیا تھا، مگر پکڑ دھکڑ اور خوف و ہراس کی وجہ سے صرف ۴۹۸ امیدوار کاغذات جمع کرا سکے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مصری تجزیہ نگار نبیل شرف الدین کے بقول: ان ۴۹۸ میں سے صرف ۲۰ امیدواروں کے کاغذات نامزدگی منظور ہوسکے، باقی سب کے کاغذات ہی مسترد کر دیے گئے۔ اخوان کے نائب مرشدعام ڈاکٹر محمد حبیب نے اعداد وشمار کی روشنی میں اس صورت حال پر پریس کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ اب ایسے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے علاوہ ہمارے پاس اور کیا چارۂ کار ہے۔ اخوان کے علاوہ ایک اور تنظیم تحریکِ مصر برائے تبدیلی (کفایة) نے بھی ان فراڈ انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔ ان دونوں تنظیموں نے تمام سیاسی گروپوں اور آزاد امیدواران سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ انتخابات کا بائیکاٹ کردیں۔ اسی طرح ٹریڈ یونینز نے بھی ان انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔ تجزیہ نگاروں کے بقول عملاً پولنگ اسٹیشنوں پر اُلّو بول رہے تھے اور حکومتی کارندے آزادانہ ٹھپے لگا رہے تھے۔

حقوقِ انسانی کی تنظیم برائے عرب دنیا نے ۱۸ اپریل کو اس تشویش ناک صورت حال پر اپنے ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مصر میں بدترین قسم کا سیاسی انتقام لیا جا رہا ہے۔ تمام بنیادی حقوق معطل ہیں، حتیٰ کہ عسکری عدالتوں کا جو ڈھونگ رچایا گیا ہے، اس میں ملزمان کے

رشتے داروں اور وکلا تک کو جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے علاوہ کسی فوٹوگرافر اور صحافی کو بھی ان کے قریب پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ اگر کوئی صحافی اور کیمرہ مین وہاں پہنچ بھی پایا، تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرے تک چھین لیے گئے۔ انسانی حقوق کی اس تنظیم نے کہا ہے کہ انصاف کے عالمی ضوابط و قوانین کے علاوہ مصری دستور کی دفعہ ۱۶۹ کے تحت یہ ظلم کسی صورت گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

ان حالات میں بظاہر حسنی مبارک نے بلدیات سے حزبِ اختلاف کا نام و نشان مٹا دیا ہے مگر مصر اور پوری دنیا کے مہذب شہری اس انتخاب کو ایک ڈرامے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ اخوان کے نائب مرشد عام ڈاکٹر محمد حبیب نے اخباری نمایندوں سے بات چیت کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ یہ ہتھکنڈے نہ تو مصری حکومت کو استحکام دے سکتے ہیں، نہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے حریت پسندوں کو سرنگوں کر سکتے ہیں۔ عالمی جریدے الشرق الاوسط کے تجزیہ نگاروں کے مطابق حسنی مبارک اپنے بیٹے جمال کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر چکا ہے۔ لیکن ان اوچھے حربوں سے حکومت اور ایوانِ صدارت کی ساکھ بُری طرح سے متاثر ہو چکی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب حسنی مبارک دور کا خاتمہ قریب ہے کیونکہ مصر میں جس قدر نفرت موجودہ حکومت سے پائی جاتی ہے، اس کی کوئی مثال ماضی میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

بلدیاتی انتخابات کے بعد مصر میں وسیع پیمانے پر احتجاج ہو رہا ہے۔ حسنی مبارک نے اس صورت حال کو آہنی ہاتھ سے قابو کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ملک بھر میں ۲۸ گورنروں (ڈی سی) کا نئے سرے سے تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔ ان میں سے ۱۲ نئے چہرے سامنے آئے ہیں، جب کہ تین کے اضلاع تبدیل کیے گئے اور ۱۳ سابقہ اضلاع ہی میں بحال رکھے گئے ہیں۔ ان سے حسنی مبارک نے گذشتہ ہفتے حلف لیا ہے اور انھیں تلقین کی گئی ہے کہ امنِ عامہ میں گڑبڑ کرنے والوں سے سختی سے نمٹا جائے۔ ان گورنروں نے حلف کے بعد اعلان کیا کہ ان کی ترجیحات میں ان عناصر کی بیخ کنی سرفہرست ہے جو امن و امان کا مسئلہ پیدا کریں، نیز وہ صدر کے سیاسی پروگرام کے محافظ بن کر کام کریں گے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومتی عزائم کیا ہیں۔

عراق سے امریکی فوجیوں کی واپسی

محمد ایوب منیر ٥

عراق میں امریکی جارحیت کے پانچ سال مکمل ہونے پر دنیا بھر میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ امریکی حکومت کو خود امریکی عوام اور دانش وروں اور کانگرس کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔ عملاً امریکا کو اس جنگ کی بھاری قیمت چکانا پڑ رہی ہے اور روز بروز امریکی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب صدام حسین کی حکومت کا تختہ ۲۰۰۳ء میں اُلٹا گیا تو امریکا کے سامنے بظاہر دو اہداف تھے: اجتماعی تباہ کاری کے ہتھیاروں کی بازیابی اور مشرق وسطیٰ میں بتدریج جمہوریت کا قیام۔ یہ اہداف تو حاصل نہ ہوسکے اور امریکا اب ایران میں 'موت کا رقص' شروع کرنے کے لیے تمام ممکنہ تیاریاں کر رہا ہے۔ صدام حسین کے بعد عبوری حکمران کونسل اور اُس کے بعد دستوری حکومت، امریکی انتظامیہ کے اشارے پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں تھیں جن کا اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں دو ورقہ پڑھ کر سنا دینے کے سوا کوئی کردار نہیں۔ نوری کامل المالکی یہ کام بخیر وخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ ہر روز مختلف لسانی اور مذہبی گروہوں میں تصادم ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ ''افواج کا قیام بے انتہا ضروری ہے''۔ شیعہ، سُنّی اور کُرد سیکڑوں برس سے عراق میں رہ رہے ہیں۔ مگر یہ امریکی پالیسی سازوں کا کمال ہے کہ وہ تینوں گروہوں کو وافر مقدار میں اسلحہ بھی فراہم کرتے ہیں، ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ بھی کرتے ہیں، اور بعدازاں تینوں گروپوں کے گرفتار شدہ مجاہدین، اور ہلاک شدہ 'جہادیوں' کی تصاویر بھی عالمی نشریاتی اداروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

کُردوں کی قوم پرست تحریک نے بھی اِس عرصے میں شدت اختیار کرلی ہے۔ شام، ایران اور عراق میں پھیلے ہوئے کُرد آزاد ریاست کی منزل تک نہ پہنچ سکیں گے اگرچہ 'نیوکونز' کے

---

٥ لیکچرار، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، لاہور کینٹ

پالیسی سازوں کے سامنے ایک یہ حل بھی موجود ہے کہ عراق کو سُنّی، شیعہ اور کُرد عراق ریاستوں میں تبدیل کر دیا جائے جو خود مختار ہوں لیکن امریکا کی باج گزار ہوں اور امریکی اشارے پر کسی بھی ہمسایہ عرب ریاست کے خلاف فوجی کارروائی کر سکیں یا امریکی کارروائی کے لیے 'محفوظ پناہ گاہ' فراہم کر سکیں۔ تین شمالی صوبوں میں کُردوں کی علاقائی حکومت ہے۔ اُن کی مسلّح افواج، قومی نشان اور جھنڈا ہے، لیکن داخلی بدامنی اور قومی انتشار نے اُن کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ جنگ اور فوجی کارروائی کا منظر ہی اُنھیں نجات کا منظر نظر آتا ہے۔ ایک ہزار سے زائد قبائل اور گروہ عراق میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے باہمی لسانی، قبائلی اور تہذیبی اختلافات بھی ہیں، تاہم اس پر اُن کا اتفاق ہے کہ غیر ملکی حملہ آوروں کا نہ ساز و سامان واپس جائے اور نہ وہ خود زندہ واپس لوٹیں۔ امریکا کی جانب سے مسلط جنگ اور باہمی خوں ریزی سے عراق میں ۱۰ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ تباہی و بربادی کے جو مناظر تشکیل پائے ہیں، عالمِ انسانیت اس پر ہمیشہ نوحہ کناں رہے گی۔

امریکی انتظامیہ ۵۰۰ ارب ڈالر خرچ کرنے کے بعد اور تو کچھ حاصل نہ کر سکی، تاہم سرکاری اعلان کے مطابق ۴ ہزار امریکی فوجیوں کی لاشیں امریکا پہنچ چکی ہیں، ۲۳ ہزار اپاہج اور زخمی فوجی، مختلف امریکی ریاستوں میں زیرِ علاج ہیں (www.antiwar.com)۔ امریکا عراق میں جنگ جاری رکھنے کے لیے ۲۷ کروڑ (۲۷۰ ملین) ڈالر روزانہ خرچ کر رہا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکا مجبور ہے کہ ہر ایک منٹ میں ۵ لاکھ ڈالر جنگی اخراجات کی صورت میں خرچ کرے۔ معروف تحقیقی مجلّے فارن پالیسی نے ناکام ریاستوں کا گوشوارہ ۲۰۰۷ء میں عراق کو دنیا کی ناکام ترین ریاستوں میں دوسرا نمبر دیا ہے۔ تیل کی دولت سے مالا مال ریاست کو اس مقام تک پہنچانے کا سہرا واشنگٹن کے سر بندھتا ہے۔

امریکا کے سرکاری ترجمان اور پالیسی ساز ادارے جو اعلان بھی کریں، عراق سے امریکی افواج کو بالآخر نکلنا پڑے گا۔ پانچ برس قبل عراق پر مکمل امریکی تسلط تھا، اب اقتدار برائے نام سہی عراقی انتظامیہ کے پاس ہے۔ امریکی بحری، برّی اور فضائی افواج کی نوعیت بھی ماضی والی نہیں رہی۔ امکان ہے کہ امریکی انتظامیہ اپنے فوجی دستے بتدریج عراق سے نکال لے، لیکن اس کی فوجی چھاؤنیاں اور دستے یہاں موجود رہیں گے، چاہے وہ دنیا کے دکھاوے کے لیے عراقی حکومت

سے معاہدے کے بعد یہاں رہیں۔ ایسے معاہدے امریکی حکومت 'جنوبی کوریا' کی حکومت سے بھی کرچکی ہے اور یہ سہولت وہاں براجمان ہے۔

امریکا کو عراق میں قیام کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور مزید ادا کرنا پڑرہی ہے۔ عراق پر قبضے کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے ہوئے، خود امریکی عوام نے اس سے نفرت کا اظہار کیا۔ عراقیوں کی صدام حسین سے ناراضی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، تاہم امریکی فوجیوں سے نفرت اُس سے کئی ہزار گنا زیادہ ہے۔ عراق کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں امریکا کے خلاف مظاہرے نہ ہوئے ہوں، یا امریکی فوجیوں کو نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ امریکی فوجیوں کی سب سے بڑی تعداد دارالحکومت بغداد میں ہے اور یہیں سب سے زیادہ پُرتشدد واقعات رونما ہوئے ہیں۔ بم مارنے اور فوجی گاڑیاں اڑا دینے کے واقعات عام ہیں۔ عراق میں بم مارنے اور باہمی کُشت وخون کے کُل واقعات کا ایک چوتھائی بغداد میں رونما ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے کہا تھا: عراق میں جنگ غیرقانونی ہے، کیونکہ یہ اقوام متحدہ کے چارٹر پر پورا نہیں اُترتی۔

واشنگٹن کے پالیسی ساز کانگرس کے دباؤ اور عوامی ردعمل کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر فوری طور پر افواج، عراق سے واپس بلا لی گئیں تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ امریکی افواج عراق میں ناکام ہوگئیں، نیز یہ کہ امریکی افواج کے عراق چھوڑ دینے سے دنیا بھر کے 'دہشت گرد' عراق میں اکٹھے ہوجائیں گے۔ امنِ عالم، جمہوریت، روشن خیالی اور مہذب دنیا کو ناکام کرنے کے لیے نائن الیون، سیون سیون اور سیون الیون جیسے واقعات بار بار رونما ہوں گے۔ اس لیے کُلی طور پر نہیں، جزوی طور پر امریکی افواج اور بحری وفضائی بیڑے کی موجودگی ضروری ہے اور مشرق وسطیٰ میں 'جمہوریت کی ترویج' کی منزل بھی تو حاصل نہیں ہوسکی ہے۔

اگلے صدارتی انتخابات جیتنے والا امریکی صدر مجبور ہوگا کہ سال ۲۰۰۸ء میں امریکی افواج کی تعداد میں واضح طور پر کمی کا اعلان کردے۔ سول سوسائٹی کے ارکین اور کانگرس مشترکہ طور پر مطالبہ کرچکے ہیں کہ فوج واپس بلائی جائے۔

امریکا نے بغداد میں جو حکومت قائم کی ہے، وہ بھی مجبور ہوجاتی ہے کہ امریکا کے غیرقانونی، غیراخلاقی تسلط کے خلاف لب کشائی کرے۔ جولائی ۲۰۰۶ء میں عراقی پارلیمنٹ کے

اسپیکر نے عراق پر امریکی حملے اور اس کے نتائج کو 'ذبح کرنے والوں کی کارروائی' قرار دیا۔ عالمی پیمانے پر بھی امریکا کو تنہائی کا سامنا ہے۔ کئی ممالک نے واشنگٹن کے اتباع میں، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے فوجی عراق بھیجے تھے، مگر اب اُن میں سے اکثر نے اپنی فوجیں عراق سے نکالی ہیں۔ برطانیہ بھی اپنی فوجیں عراق سے نکال رہا ہے جو کہ امریکا کا جاں نثار 'شریکِ کار' رہا ہے۔ اُس کے بعد امریکا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عراق میں اپنی افواج کو 'کثیر المُلکی فوج' قرار دے۔

چین کی سوشل سائنس اکیڈمی میں انسٹی ٹیوٹ برائے مطالعہ مغربی ایشیا و افریقہ قائم ہے۔ اس کے مطالعہ مشرقِ وسطیٰ کے ڈائرکٹر وانگ جنگ لی کا کہنا ہے:

> گذشتہ پانچ برسوں میں سیاسی تعمیرنو کے دوران، عراق کو انتہائی ناہموار حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وفاقی نظام اور سیاسی انتشار نے عراق کی شناخت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ عراق کو ایسی سیاسی قوت کی ضرورت ہے کہ جو لسانی، مذہبی اور قبائلی تعصب سے بالاتر ہو کر تعمیرنو کا مقامی عمل شروع کرے۔ یہ قوت عراق ہی سے اُبھرنی چاہیے، باہر سے آنے والی قوت یہ کام نہ کرسکے گی، نہ امن وامان اور سرحدوں کی حفاظت کا کام ہی، بیرونی ایجنٹ سرانجام دے سکیں گے۔

روسی افواج ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں داخل ہوئیں اور ۱۹۹۲ء تک واپس جا چکی تھیں لیکن اس عرصے میں روس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ سوویت یونین کے زوال پذیر ہونے کی صورت میں سامنے آیا۔ امریکا کو ویت نام، کوریا اور اب عراق کے تجربے سے یہ سیکھ لینا چاہیے کہ 'عالمی داداگیری' کے دورانیے کو طول دیتے ہوئے اُس کو داخلی محاذ پر شکست در شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکی اراکینِ کانگرس، اراکینِ سینیٹ، تھنک ٹینکس، سول سوسائٹی کے ارکان اور انسانی حقوق کی آواز بلند کرنے والے امریکی عوام یقیناً اپنی حکومت پر دباؤ ڈالیں گے کہ عراق سے اپنی افواج واپس بلالیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اُن کی معیشت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا، اور امریکا سے بڑھتی ہوئی نفرت انتقامی جذبے کو ہوا دینے کا باعث بنے گی جس سے عالمی امن تباہ ہوسکتا ہے اور اس کی ذمہ داری امریکا کے سر ہوگی۔ کاش! امریکی حکمران عقل کے ناخن لیں۔

ایک قابلِ رشک زندگی، ڈاکٹر فوزیہ

قانتہ ذکی ؂

اس پُرآشوب دور میں، جب کہ انسانیت تیزی سے جاہلیت کی کھائی میں گرتی چلی جارہی ہے، گنتی کے چند لوگ ایسے ہیں جو اپنا تن من دھن اللہ کی خاطر لگا کر دنیا و آخرت میں سرخ رُو ہوتے ہیں اور اُمت مسلمہ کے لیے امید کی کرن بن کر پھوٹتے ہیں۔ انھی قابلِ قدر ہستیوں میں سے ایک میری شفیق استاد ڈاکٹر فوزیہ ناہید گذشتہ ماہ (۱۳ر مارچ ۲۰۰۸ء) نفسِ مطمئنہ کی طرح راضی برضا، اپنے رب سے جاملیں، اناللّٰہ وانا الیہ رٰجعون!

ڈاکٹر فوزیہ ناہید ۷ فروری ۱۹۶۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ابھی آٹھ برس کی تھیں کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ زمانۂ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طالبات سے وابستہ ہوئیں اور مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہنے کے بعد ناظمۂ اعلیٰ منتخب ہوئیں۔ بعدازاں پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (خواتین، PIMA) اور جماعت اسلامی حلقۂ خواتین میں مختلف ذمہ داریاں بھرپور انداز سے ادا کیں۔ وہ پچھلے ۱۲ برس سے امریکا میں مقیم تھیں۔ امریکا میں اسلامی تحریک اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا (ICNA) کے حلقۂ خواتین کی چار سال تک ناظمۂ اعلیٰ رہیں اور آخری دم تک تحریک کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا، اور بہت سے لوگوں کو ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی یہی نیکیاں ان شاء اللہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں گی۔

؂ نیوجرسی، امریکا

● **سراپا تحریک**: ان کی پوری زندگی سراپا تحریک تھی۔ ہر رول میں، ہر جگہ، ہر دائرۂ کار میں جہاں انھوں نے کام کیا، ایک تحریک برپا کی اور دعوت، تنظیم و تربیت کا بیک وقت کام کیا۔ طالبہ علم کی حیثیت سے کالج و یونی ورسٹی میں، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے اپنے گھر والوں میں، ڈاکٹر کی حیثیت سے پروفیشنل خواتین میں، بہو کی حیثیت سے اپنے سسرال میں، بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ، ماں کی حیثیت سے اپنے بچوں میں اور پھر جس جس حلقے میں ان کی رہایش رہی، ہر جگہ انھوں نے مستحکم بنیادوں پر کام کیا جس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بلاشبہہ بہت سے لوگ اخلاص و ایثار سے خدمت کرتے ہیں، قرآن و حدیث کا علم پھیلاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ سب کام کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو تحریک سے جوڑتے ہیں، ان کا تزکیہ و تربیت کرتے ہیں اور انھیں اپنی صلاحیتوں کو تحریک میں کھپانا سکھاتے ہیں، اور باہم اخلاص کے رشتے میں پرو دیتے ہیں۔ آخری برسوں میں بھی فوزیہ باجی کو تنظیم جس بھی ٹیم کے ساتھ کر دیتی وہ ٹیم خود بخود سب سے زیادہ متحرک ہو جاتی۔ وہ ان سے صرف کام نہیں لیتی تھیں، بلکہ ان سے محبت کرتی تھیں، ان کا تزکیہ و تربیت کرتی تھیں، ان کو دعوت کے عملی طریقے سکھاتی تھیں، نظمِ بالا سے جوڑتی تھیں، اور ان کے اندر قائدانہ اوصاف کو اُجاگر کرتی تھیں۔ شورائیت، بصیرت، قوتِ فیصلہ اور حکمت، ہر لحاظ سے ہمہ پہلو محنت کرتی تھیں۔

● **دعوت الی اللہ کی تڑپ**: ان میں اللہ کی طرف بلانے کی بے پناہ تڑپ تھی۔ جس نے بھی ان کے ساتھ چند گھنٹے گزارے اس نے اس چیز کو محسوس کیا۔ امریکا میں ان کے کام کو دیکھنے کا مجھے زیادہ قریب سے موقع ملا۔ نیویارک کے مختلف علاقوں اور پھر ریاست کینٹکی میں انھوں نے خواتین میں صفر سے کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے پہلے خواتین سے انفرادی روابط استوار کیے، پھر دعوتی حلقے قائم کیے، قرآنی کلاسز اور دورۂ تفسیر وغیرہ کے ذریعے لوگوں کو اپنے مقصدِ زندگی پر سوچنے کی دعوت دی۔

پہلے سال جب فلوریڈا پہنچی تھیں، تو ان کے جاے قیام کے قریب مسلمانوں کی کوئی بہت بڑی آبادی نہ تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے صرف ایک ملائیشین خاتون کے ساتھ بیٹھ کر دورۂ قرآن مکمل کیا۔ اس زمانے میں وہ پہلی بار انگریزی میں قرآن کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اپنے اس

تجربے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ میں ڈکشنری ساتھ رکھتی تھی اور ترجمے کے دوران جو لفظ بہت مشکل سا آجاتا تو اس کو دیکھتی جاتی تاکہ ملایشی بہن کو سمجھانے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد نیویارک میں کثیر تعداد کے حلقوں میں دعوتی کام کیا۔ پاکستانی، امریکی، عرب ہر زبان بولنے والی خواتین پر اثر ڈالا۔

میں حیران ہوتی تھی کہ فوزیہ باجی کے نہ صرف پاکستانی بلکہ دوسرے ممالک کی خواتین سے بھی اتنے اچھے اور مؤثر تعلقات کیسے قائم ہیں۔ پاکستان سے آنے والے پڑھے لکھے طبقے کی انگریزی ویسے تو بہت اچھی ہوتی ہے لیکن یہ بولنے میں گھبراتے ہیں اور بوجھل لہجے کی وجہ سے امریکیوں کو ان کی بات سمجھنے میں دقت بھی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ آپ ان سب لوگوں سے کیسے اتنی دوستی کرلیتی ہیں؟ ان کے مزاجوں کو کیسے سمجھ لیتی ہیں؟ آپ تو یہاں امریکا میں پلی بڑھی نہیں ہیں۔ پھر یہاں کے ماحول میں بسنے والوں کے ذہنوں کو کیسے پڑھ لیتی ہیں؟ اس پر وہ اپنے روایتی انداز سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور بولیں: ''دیکھو! اللہ تعالیٰ کیسے کیسے لوگوں سے اپنا کام لے لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک داعی کی تڑپ اور خلوص ان تمام ظاہری کمیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

کسی نے تھوڑا عرصہ ساتھ گزارا ہو یا زیادہ، فوزیہ باجی ایک مثالی کارکن کی طرح اسے کسی نہ کسی طریقے سے دعوت ضرور دیتی تھیں۔ ایک بار وہ اپنی بیٹی کے علاج کے لیے امریکا ہی کی کسی دوسری ریاست کے ہسپتال میں کچھ روز کے لیے ٹھیری ہوئی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے وہ اپنا وقت ضائع نہ کرتیں۔ اپنی بیٹی کو کتابیں پڑھ کر سناتیں یا پھر فراغت ملتے ہی اپنے زیرتربیت دو تین خواتین کو ہسپتال کا نمبر دے دیا تاکہ رابطہ رہے اور نظم کے کام نہ رکیں۔ کچھ دیر کاموں کی ہدایات دینے کے بعد انھیں کہنے لگیں: ''دیکھو، میں یہاں نیم پرائیویٹ کمرے میں ہوں۔ یہاں پر ایک اور امریکن عورت بھی ہے جو اپنے بچے کو لائی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا ہے کہ اس کو میرا فون پر زیادہ دیر تک باتیں کرنا، ناگوار گزرتا ہے۔ میں تھوڑی دیر اس سے باتیں کر کے کچھ گنجایش پیدا کرتی ہوں۔ ان شاء اللہ تم سے بعد میں بات کروں گی''۔ اگلے روز میں نے پوچھا: ''کیا ہوا، اس عورت سے بات کیسی رہی؟'' تھوڑا سا ہنستے ہوئے بتانے لگیں کہ: ''پہلے تو وہ خفا خفا ہی رہی، مگر پھر میں نے کچھ اس کی خدمت کی، ہاتھ بٹایا، بچے کے حوالے سے بات چھیڑی۔ اس کی

مشکلات دریافت کیں اور پھر ان کے حل بتائے۔ اس طرح وہ ذرا مائل ہوئی۔ آخر میں خود ہی میرے بارے میں، اسلام کے بارے میں میم صاحبہ نے اتنے سوالات کیے کہ خودبخود میرا کام ہوگیا۔ اس کو قرآن کا ترجمہ اور کچھ کتابچے میں نے تحفے میں دیے اور بہت سی ویب سائٹس سے تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔

یہ تین سال پہلے کی بات ہے جب انھیں کینسر ہوگیا، تو شروع میں انھوں نے ہر ذمے داری سے فوراً استعفا دے دیا تھا، اور صرف زیرتربیت افراد اور مرکزی نظم کے تربیتی کاموں میں ہاتھ بٹانے کی ہامی بھر لی تھی۔ جب ان کی پہلی کیموتھراپی اختتام کو پہنچی تو ہم سب سمجھ رہے تھے کہ وہ فہم قرآن کلاسز میں ٹیچر کی حیثیت سے واپس آ کر ہمارے ارکان و امیدواران کی تربیت میں حصہ ڈالیں گی، لیکن انھوں نے اس ذمے داری کو لینے سے انکار کردیا۔ میں نے اپنے طور پر ان کو راضی کرنے کی کوشش کی تو کہنے لگیں: ''اب کلاس کو اور تربیت کے اہم کام کو نئی ٹیم کے ساتھ باقاعدگی سے چلنے دو۔ میری طبیعت کا کچھ پتا نہیں ہے۔ آج ٹیسٹ صحیح آئے ہیں، کل نہ جانے کیا ہو۔ تم فکر نہیں کرو، اس کے باوجود میں 'غیرفعال' ہوکر نہیں بیٹھوں گی، ان شاء اللہ۔ پھر وہ 'اکنا' کے دعوتی پراجیکٹ Why Islam? (اسلام ہی کیوں؟) میں مرکزی سطح پر بھی شامل ہوگئیں، اور اس کام میں خواتین کے نظم کا بھرپور منصوبہ تیار کرایا۔ مقامی آبادی میں تیزی سے کام کرنے کے حوالے سے کارکنان کے اندر جذبہ بیدار کیا۔ مردانہ نظم سے ان تمام چیزوں پر تفصیلی مکالمہ کیا، اور 'اسلام ہی کیوں؟' پراجیکٹ کے لیے مرکزی ٹیم تیار کی۔

● **تعداد اور معیار میں توازن**: دعوتی اور تربیتی کاموں میں فوزیہ باجی کی توجہ اس بات پر ضرور ہوتی کہ تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ معیار کو ذرہ برابر بھی گرنے نہ دیں، یعنی صرف افراد جمع کرلینے ہی پر ان کی توجہ مرکوز نہ ہوتی، بلکہ لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی کو وہ اپنا اصل ہدف بناتیں۔ بیک وقت یہ سارے کام کرنا اگرچہ مشکل ہے، لیکن بقول ڈاکٹر فوزیہ: ''تحریک تو پھر اسی چیز کا نام ہے''۔

'اکنا' کا کام ایک عرصے تک صرف پاکستانی طبقے اور اُردو زبان بولنے والے مسلمانوں ہی تک محدود تھا۔ پھر ۹۰ کے عشرے میں انگریزی میں کام کی طرف پیش رفت ہوئی۔ ڈاکٹر فوزیہ کی

نظامت کے دوران کچھ ارکان کی طرف سے نظام کو یک سر تبدیل کر کے ہر چیز کو فوراً انگریزی میں لانے کا مطالبہ بہت زور وشور سے کیا گیا۔ انھوں نے اس پر بہت حکمت اور سلیقے سے کام کیا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہمیں بہت اہم کام کرنا ہے۔ امریکا میں اسلامی تحریک و دعوت کا کام کوئی اتنا آسان نہیں ہے کہ ہر کاغذی کارروائی کا انگریزی میں ترجمہ کر دو اور یہ کام ہوگیا۔ اس کے لیے دیرپا کام کرنا ہوگا۔ پہلے ہم میں سے ایسے افراد تیار ہوں جو مقامی آبادی کو سمجھ کر ان میں دعوتی کام کرسکیں۔ پھر جو لوگ مقامی آبادی میں سے تحریک سے وابستہ ہوں، ان کی تنظیم و تربیت کا معقول انتظام انھی کی زبان میں کیا جائے۔ اس کے لیے ویسا ہی نظام ہو جیسا مولانا مودودی نے تحریک کے شروع میں کیا تھا۔ انھی کی زبان میں لٹریچر تیار ہو، ان کی تربیت گاہیں ہوں، وہ تنظیمی اجتماعات کریں، تاکہ پہلی مقامی ٹیم کو تحریک کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ اس کا طریقۂ کار، دعوت و تنظیم اور تربیت کا ربط، دوسری تنظیموں اور اس میں فرق اچھی طرح ان پر واضح ہو جائے۔ ان کی بنیادی عبادات، اخلاقیات سب پر سیر حاصل کام ہو اور پھر یہ لوگ نکل کر اس ملک میں بھرپور کام کریں۔ ساتھ ہی اُردو زبان بولنے والے، تارکین وطن کو بھی لے کر چلیں۔ اس طرح دوسری آبادیوں، ہسپانوی، بنگالی، عرب وغیرہ سب کے اندر دعوت پھیلائیں۔

● **افراد کی تیاری**: اسلامی اقدار کی سینہ بہ سینہ منتقلی، محبت اور خلوص کے ساتھ افرادِ کار کی تربیت کا کام وہ بہت عمدگی سے کرتی تھیں۔ لوگوں کے مزاجوں کو سمجھنے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ افراد کو ان کے مزاج اور صلاحیتوں کے لحاظ سے صحیح ذمہ داری پر لگاتیں۔ ہمیشہ بنیادی چیزوں کی تربیت پر سب سے پہلے توجہ دیتیں اور بعد میں بھی اکثر انھیں بنیادی چیزوں کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں۔ نماز، اس کی پابندی، اس میں خشوع، روزانہ کا باقاعدہ مطالعہ، قرآن سے ربط و تعلق، اس پر تدبر، حدیث و سیرت کا مطالعہ، اس سے سبق اخذ کرنا، تحریکی لٹریچر کا مطالعہ، حلقے میں دعوتی کام، وغیرہ ان چیزوں کو سب سے پہلے صحیح کرواتی تھیں۔ مگر اس میں ان کا انداز ایک ٹیچر کا نہیں بلکہ ایک پُرخلوص بہن اور ساتھی کا سا ہوتا۔ اپنے زیرتربیت روابط سے کہتیں: ''چلو، ہم دونوں یوں کرتے ہیں کہ روزانہ فجر کے بعد ایک دوسرے کو فون کریں گے اور ساتھ ساتھ فون پر ہی مطالعہ کریں گے تاکہ میں مطالعہ کرتے ہوئے سو نہ جاؤں''۔ کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیتیں کہ وہ تو

ان چیزوں کی پہلے ہی سے پابند ہیں۔ کہتی تھیں کہ ہمارا کام اتنا کھوکھلا نہیں کہ بس چند وعظ و تقریریں ہوں اور بہت واہ واہ ہو۔ ہمیں تو دلوں کے دروازے کھٹکھٹانے ہیں، دلوں کو بدلنا ہے جیسا کہ پیارے نبیؐ نے کیا تھا۔ دل کے اوپر بہت سے لبادے اور تالے ہوتے ہیں۔ اپنے ہی دل کو جھانک کر دیکھ لیں۔ پیارے نبیؐ کا فرمان ہے: تقویٰ یہاں (دل میں) ہے۔

سیرت و اخلاق کے حوالے سے تربیت کے لیے بہت سے افراد کو آپس میں جوڑ دیتی تھیں۔ مختلف مزاج کے افراد کی جوڑی بنا دیتی تھیں۔ اگر نئے اور پرانے افراد میں کھچاؤ محسوس ہوتا تو ایک نئے اور ایک پرانے فرد کو آپس میں کام کرنے کو دے دیتیں۔ نوجوان اور بزرگ افراد کو ساتھ کر دیتیں۔ اسی طرح شوریٰ میں بہت زیادہ بولنے والے شخص اور بہت خاموش رہنے والے کی جوڑی بنا دیتیں اور ساتھ بتا بھی دیتی تھیں کہ فلاں سے تم بات کی تہہ تک پہنچنا اور رائے بنانا اور فیصلہ کرنا سیکھو، اور تم فلاں سے فورم پر صحیح انداز میں سلیقے کے ساتھ بات کو پیش کرنا سیکھو۔ 'اکنا' میں اخوہ نظام کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی۔ یہ اخوان کے نظام اسرہ کی طرح آپس میں کارکنان کے گروپس اور جوڑے ہیں۔ پہلے صرف ارکان میں پھر تمام کارکنان میں اس کو رائج کیا گیا۔ پھر افراد سے بڑھ کر ٹیموں اور شوراؤں میں، پھر اس سے بڑھ کر شہروں کا نظام بنا دیا گیا، تاکہ شہروں کے نظم اور شورائیں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھیں اور سیکھیں۔

● **شخصیت پرستی کا توڑ**: اس دور میں، جب کہ اُمت مسلمہ میں اور خاص طور پر امریکا میں دینی حلقوں میں خصوصاً شخصیت پرستی کا رواج عام ہے۔ افراد مقرر کے نام کی وجہ سے اس کو سننے آتے ہیں، خوب واہ واہ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، یا پھر تبدیلی آتی ہے تو صرف ایک فرد سے جڑتے ہیں، پوری تنظیم و تحریک سے وابستہ نہیں ہوتے، اور جب وہ فرد وہاں سے ہٹتا ہے تو پھر غیر فعال ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی ذات کو دعوت کا مرکز بننے نہیں دیا۔ ہمیشہ ٹیم کی تیاری کی اور پھر اس کو نظم سے جوڑا، آپس میں جوڑا، دعوتی تڑپ اور تزکیے کی پیاس دی، اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے کے ڈھنگ سکھائے، خود اعتمادی دی اور پھر عملی میدان میں مغفرت کی طرف دوڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔

قرآن فہمی کے تین سالہ کورس میں ہم نے انھیں ''میں ایسی ہوں'' یا پھر ''میں ایسا کیا کرتی

ہوں'' کہتے نہیں سنا۔ وہ آج کے دور کی بہت سی مثالیں دیتیں، لیکن دوسروں کی۔ اس میں بھی انھوں نے توازن کی تلقین کی۔ نظم کے افراد کا، مقررین کا، نمایاں کام کرنے والے تحریک کے ارکان وکارکنان کا تعارف اور ان کے کام کے تذکرے کو بالکل درست سمجھتی تھیں۔ شعبہ تربیت کے تحت ''میں نے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ کیسے پایا؟'' کے عنوان سے یہاں پر مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا تھا۔ نظم نے اس مقابلے کے مضامین کو بغیر ناموں کے ایک کتاب میں چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے وقت وہ پاکستان گئی ہوئی تھیں۔ واپس آ کر انھوں نے نظم کو قائل کر کے اور اس کی اجازت سے اپنی کتاب میں تمام افراد کے نام لکھوائے۔

ہر اجتماع میں ضرور کسی نہ کسی ساتھی کا تعارف یا اس کی تعریف ضرور کرتیں، آپس میں ان میں محبت پیدا کرتیں اور پھر نظم کے ساتھ جوڑ کر خود ان افراد کو چھوڑ دیتیں۔ بعض اوقات اگر ان ساتھیوں کے بہت فون آتے تو ارادہ کر کے انھیں نہ سنتیں اور کہتیں کہ اب آپ اپنے متعلقہ نظم سے تعلق رکھیں۔

● **درس و تدریس اور عملی تربیت:** قرآن وحدیث پڑھانے کے دوران میں وہ صرف نظریاتی باتیں نہیں کرتی تھیں، بلکہ پوری طرح علمی و تحقیقی بات رکھنے کے بعد عملی مثالیں ضرور دیتیں اور آخر میں عمل کے لیے کرنے کو کام بھی دیتی تھیں، جن کے بارے میں کلاس میں پوچھا جاتا تھا۔ اس طرح وہ علم اور تربیت کا کام ساتھ ساتھ کرتیں۔ شروع کے قرآنی پاروں کو پڑھانے کے بعد پوچھتی تھیں کہ اب لوگ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شروع میں نماز اور انفاق وغیرہ کے لحاظ سے کام دیے۔ نمازوں اور مطالعے کی پابندی کے لیے پانچویں پارے کے ساتھ ہی انفرادی جائزہ رپورٹ فارم کا تعارف دیا اور پارے کے ٹیسٹ میں اس کو روزانہ پُر کرنے کے بونس نمبر رکھ دیے۔ شروع ہی کے سپاروں میں اجتماعیت کا تعارف اور اس میں شامل ہو کر نصاب، تربیت گاہیں، کلاسز وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کی رغبت دلائی۔ پھر جب پندرھویں پارے پر پہنچے تو پچھلی کلاس کے حوالے سے انبیاے کرامؑ کے دعوتی انداز وغیرہ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہنے لگیں: ''اب مجھے یہ جواب نہیں چاہیے کہ یوں کرنا چاہیے اور یوں ہونا چاہیے، بلکہ اب یہ بتائیں کہ ہم نے حلقے میں یہ کیا اور یہ نہ کیا، اگر آدھے قرآن کے تفصیلی مطالعے کے بعد بھی عملاً دعوت

شروع نہ کی تو پھر یہ قرآن ہمارے خلاف کہیں حجت نہ بن جائے''۔

قرآن پاک کو خود انھوں نے کئی علما سے پڑھا ہوا تھا لیکن پھر بھی بہت محنت سے متعدد تفاسیر، اور بے شمار احادیث و سیرت کی کتب اور اسلامی لٹریچر سے تیاری کرتی تھیں۔ ہر ہر فرد کو فون کرتیں، ان سے روابط رکھتیں، فاصلوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح ضرور ملنے کی کوشش کرتیں۔ اپنے روابط اور زیرتربیت افراد سے یوں نہ پوچھتیں کہ ٹیسٹ کیوں نہیں دیا، بلکہ فون کر کے کہتیں: بہت دنوں سے آپ کی پوزیشن نہیں آئی، مجھے اس بات کا بہت رنج ہے۔ جون جولائی کی چھٹیوں میں اپنی فیملی کے اصرار پر فوزیہ باجی بچوں کے ساتھ پاکستان گئیں۔ واپس آئیں تو کلاس کی حاضری کافی متاثر ہوچکی تھی۔ پھر سے مہماتی انداز میں تمام افراد کو جمع کیا اور ماحول بنایا تاکہ محنت سمیٹی جاسکے۔ قرآن کی اس کلاس کے ساتھ ساتھ لٹریچر کا مختصر کورس بھی کروا دیا، افراد کو متعلقہ نظم سے جوڑا، ان کی ناظمات سے رابطے رکھے۔ کلاس کے اختتام تک بہت سی بہنیں 'اکنا' کی رکنیت کے لیے بالکل تیار تھیں صرف اس لیے نہیں کہ انھوں نے قرآن کی تفسیر کا مطالعہ کیا تھا، گرامر پڑھ لی تھی، بلکہ اس لیے کہ انھوں نے قرآن کی برپا کردہ تحریک کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھا اور اس میں عملی قدم رکھا۔ اپنے اپنے نظم کے تحت عملی اور دعوتی و تربیتی میدان میں سرگرم عمل ہوگئیں۔

● **ہمہ پہلو قائدانہ کردار**: جمعیت کی ناظمۂ اعلیٰ کی حیثیت سے انھوں نے بھرپور محنت کی اور اسی وقت سے ان کی قائدانہ صلاحیتیں اُجاگر ہوچکی تھیں۔ ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء تک وہ 'اکنا' کے خواتین ونگ کی ناظمۂ اعلیٰ رہیں۔ اس دوران انھوں نے ایک پوری ٹیم کی تیاری کی۔ مرکز، شہر، حلقہ ہر سطح پر افراد تیار کیے۔ شعبہ جات کو منظم کیا، تنظیم کو اسلامی شورائی نظام میں ڈھالا۔ ہر ہر شعبے کے مقاصد پر ڈسکشن کی تاکہ مقصد کو سمجھتے ہوئے ہر ہر ٹیم تحریک کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرے۔

دعوت کے شعبے کے تحت انھوں نے ایک ہی ساتھ تمام امریکا میں 'اکنا' کے تحت دعوت بذریعہ قرآن کے نئے نئے انداز سمجھائے۔ پہلے ہی سال سے دعوتی اجتماعات میں مختلف تقریریں اور ڈسکشنز کے بجائے قرآنی کلاسیں، خاص ترتیب کے ساتھ دروسِ قرآن اور دورۂ تفاسیر کروانے پر توجہ مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے مدرسین کی تیاری بھی تمام حلقہ جات میں بھرپور انداز سے کی۔ مرکزی سطح سے فون، دوروں اور تربیت گاہوں کے ذریعے تفصیلی ہدایات، ورکشاپس، مشقی

سیشن رکھوائے۔ وہ کہتی تھیں: 'اِدھر اُدھر جا کر درس دے کر آ جانے والے نہیں، بلکہ ان کے خیال میں تحریک کو ایک جگہ جم کر کام کرنے والے درس کے ساتھ تربیت کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے دعوتی مہمات رکھوائیں جو کہ 'اکنا' کی خواتین کے لیے کافی نیا تصور تھا۔ ان کے ذریعے کارکن کے دعوتی مزاج کو بیدار کرنے اور اس کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

شعبۂ تربیت کی ازسرِنو تشکیل و تنظیم کی۔ نصاب، جائزہ فارم، تربیت گاہیں، کلاسز، اخوہ نظام، قائدین کی تیاری، ان سب چیزوں کے مقاصد زیرِ بحث لاتے ہوئے ازسرِنو رائج کیا۔ 'اکنا' اور ایم اے ایس کے شعبۂ تربیت کی ٹیموں نے مل کر جو ہدایات مرتب کی تھیں ان کو خواتین میں عملی طور پر قائم کیا۔

نائن الیون کے بعد افراد کو سمیٹتے ہوئے 'آن لائن' (online) پروگرام کرنے کا طریقہ استعمال کیا۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کارکن کا عزم اور حوصلے کو بلند رکھا جائے۔ بزدلی اور منافقت کے بہت سے رویوں سے بھی بچنا سکھایا اور آزمایش کی صورت میں حفاظتی تدابیر کا شعور بیدار کیا۔ مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے وہ کافی مشکل مرحلہ تھا۔ بہت سے عام مغرب زدہ مسلمانوں نے تو اپنے رنگ ڈھنگ اور نام تک بدل کر غیرمسلموں جیسے کر لیے۔ بہت سے لوگ انتظامیہ کے آلۂ کار بن گئے۔ ایسے وقت میں کارکن کو اور عام افراد کو ایمان مضبوط رکھنا اور سکھانا یہ کام فوزیہ باجی اور ان کی مرکزی ٹیم نے آن لائن اور سرکلرز کے ذریعے کیا۔ آن لائن میٹنگز میں انھوں نے رخصت و عزیمت کے موضوع پر مکالمے اور تبادلۂ خیالات کا اہتمام کیا اور کہا کہ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے ہرگز ایمان کا سودا نہ کر لینا۔ ایمان کی حفاظت پہلے کرنا، خواہ اس کے لیے اصحابِ کہف کی طرح اپنے آپ کو غار میں محصور ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

ان کے دورِ نظامت ہی میں میڈیا کے حوالے سے کام شروع ہوا۔ ویب سائٹ، ای میل وغیرہ اور دیگر ذرائع بہتر استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ قیادت کی تیاری اور فکری و تحقیقی کام کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سائنسز کا انعقاد کیا۔___ غرضیکہ تھوڑی سی مدت میں انھوں نے ہر سطح پر، ہر سمت میں تحریک کو پھیلایا اور اس کو استحکام دیا۔

● **بیت المال کے بارے میں حساسیت:** بیت المال کے حوالے سے وہ بہت زیادہ

حساس تھیں۔ اس کی جواب دہی سے بہت خوف کھاتی تھیں۔ اس سے بھی ڈرتی تھیں کہ حساب کتاب میں کوئی نقص ہو اور اس سے بھی کہ اس آنے والی رقم کا صحیح استعمال نہ ہو۔ زیادہ فضول خرچی اور زیادہ تنگ نظری، یا بخل دونوں ہی سے ڈرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ اس کا بھی سوال ہوگا کہ ایک ایک پیسہ کہاں استعمال ہوا، اور اس کا بھی کہ جو آیا تھا، اس کا بہتر استعمال کرنے کے بجائے جمع کر کے کیوں رکھا؟ تربیت اور بیت المال ان کے خیال میں ناظم کی دو اہم ترین ذمے داریاں ہیں، جن کے بارے میں ہر سطح کے نظم کو سب سے زیادہ فکرمند ہونا چاہیے۔ اسی لیے وہ بیت المال کی رپورٹ وقت پر اور پابندی سے پیش کیے جانے کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔

● **اسلامک فیمنزم کا چیلنج**: آج کل دنیا میں feminism (تحریکِ نسواں) کے نظریات پورے زور و شور کے ساتھ پھیلائے جا رہے ہیں۔ عام خواتین، خواہ وہ سیکولر ہوں یا دین دار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی، پڑھی لکھی ہوں یا اَن پڑھ، شہری ہوں یا دیہاتی ـــــ سب اس سے کچھ حد تک متاثر ضرور ہیں۔ امریکا میں تو 'جدید دین دار' خواتین کا ایک ایسا گروہ بھی سامنے آ گیا ہے جو خواتین کا جمعے کا خطبہ دینا، نماز میں مردوں کی امامت کرنے اور سب کے ساتھ شانہ بشانہ نماز ادا کرنے کو بالکل جائز سمجھتا ہے۔ سوائے 'اکنا' کے تمام اسلامی تنظیمیں مرد و زن کی تفریق کو غلط سمجھتی ہیں۔ بہت سے مسلم اسکالر عورت کی حکمرانی کے خلاف دلائل کو تسلیم نہیں کرتے اور اسی وجہ سے بہت سی بڑی بڑی اسلامی تنظیموں کی صدر خواتین بھی منتخب ہوتی ہیں۔ دوسرا گروہ ایسے افراد کا ہے جو دین کے فروغ کی ذمے داری صرف مرد ہی کی سمجھتے ہیں۔ عورتوں کی باقاعدہ تنظیم ہی کے خلاف ہوتے ہیں۔ حالانکہ سب ہی عورتیں اپنی گھریلو ضرورتوں سے، دوست احباب سے ملنے یا دوسری وجوہات سے گھر سے باہر جاتی رہتی ہیں۔ سفر بھی کرتی ہیں، اکیلے پاکستان بھی چلی جاتی ہیں لیکن جب دین کے کام کے لیے گروپس میں نکلنے کو کہا جائے تو یہ انھیں شریعت کے خلاف دکھائی دیتا ہے۔

'اکنا' پر اس بات کا بہت دباؤ ہوتا ہے کہ ہم بھی دوسری تنظیموں کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کریں۔ عورتوں اور مردوں کے اندر تفریق ختم کر کے تمام کو ایک ہی حلقے کی طرح یک جا لے کر چلیں۔ مسجدوں کو 'ویمن فرینڈلی' (women friendly) بنانے کے لیے اور مسجدوں کی شوراؤں کو مخلوط بنوانے کے لیے جدوجہد کریں۔

ایسے حالات میں انھوں نے تحریک کو دونوں انتہاؤں سے بچاتے ہوئے ایک متوازن راستے پر رکھنے کی بھرپور کوشش کی کہ عورتیں اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے بھرپور تحریک چلائیں۔ ایسا نہ ہو کہ جن کی گودوں میں مسلمانوں کی اگلی نسلیں پل رہی ہیں، وہی اس تحریک، اس کے عملی اتار چڑھاؤ اور مقصدِ زندگی سے ناآشنا رہ جائیں۔ بقدرِ ضرورت تمام اسلامی حدود پر عمل کرتے ہوئے مردانہ نظم سے رابطہ بھی رکھیں۔ تمام فیصلوں میں، اِلّا یہ کہ معصیت کا اندیشہ ہو، امیر کی اطاعت اور اتباع کو اپنے اُوپر لازم سمجھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے جو عظیم مقام دیا ہے، اس سے گرنے یا اس پر شکوہ کناں ہونے کے بجاے، اس پر شکرگزاری کا رویہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں ان کی یہ بھی کوشش رہی کہ اسلامی عمومی اجتماعات کے موقعوں پر عام افراد کو بھی ضابطۂ اخلاق دیا جائے، اس کو سمجھایا جائے تاکہ اختلاطِ مرد و زن سے بچا جاسکے۔

● **حلقۂ اثر اور گھر میں تحریک**: وہ اکثر یہ کہا کرتی تھیں کہ اپنے قریب کے حلقے اور گھر والوں میں ہر کارکن کا کام اشد ضروری ہے۔ یہ نہ کرنا اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ انسان کی نیکی کی جڑ اسی سے مضبوط ہوتی ہے کہ اس کے قریب کے لوگ اندر سے تبدیل ہوجائیں اور ان کے دلوں میں اسلامی انقلاب آجائے۔

ہمارے پوچھنے پر بتاتی تھیں کہ انھوں نے تربیتی نظام کے تمام جز و جو تحریک میں قائم کیے وہ اپنے بچوں اور گھر والوں میں بھی قائم کیے۔ ان کا بھی اخوۃ نظام قائم کیا اور جوڑے بنائے، ان کا بھی رپورٹ فارم اور جائزہ سسٹم رکھا، ان سے قرآن کا مطالعہ ڈسکس کیا، شوریٰ کا نظام رکھا۔ شروع میں اخراجات کی وجہ سے تربیت گاہوں میں اپنی بیٹیوں کو نہیں لا پاتی تھیں لیکن پھر جب انگریزی میں خواتین کی تربیت گاہوں کا انعقاد شروع ہوا، تمام بیٹیوں کے ساتھ اپنی شدید علالت کے باوجود، ہنستی مسکراتی موجود ہوتی تھیں۔

اپنے بچوں کی نیکیوں پر بہت خوش ہوتیں۔ جب بڑی بیٹی چھوٹی سی عمر میں تہجد پر اُٹھنے کی خود سے کوشش کرنے لگی تو دلی مسرت کے ساتھ ہمیں بتانے لگیں۔ میں جب بھی اپنے نانا نانی یا امی ابو کا ذکر کرتی کہ ان سے ہم نے یہ سیکھا تو کہتیں: ''میں تم کو بتا نہیں سکتی کہ اولاد کی نیکی کو دیکھ کر ماں باپ کو اور بزرگوں کو کیسی راحت ملتی ہے۔ جب میرے بچے فلاں نیکی کا کام کرتے ہیں تو مجھے

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا ہی میں جنت مل رہی ہے"۔ حتیٰ کہ وہ گھر والوں سے تنظیمی ڈسکشن تک کرتی تھیں۔ تحریک کے تقابلی جائزے، سالانہ رپورٹ پر تبصرے، 'اکنا' کے دعوتی کام پر باتیں کرتی تھیں۔ واقعی اپنے گھر والوں کو نیکی کے سفر میں ساتھ ساتھ لے کر چلنا ایک مشکل کام ہے، لیکن اس کے اثرات بہت دُوررس ہیں۔

● **وقت کا استعمال**: ان کی ایک بڑی خوبی وقت کا صحیح استعمال کرنا تھا۔ ہم سب حیران رہ جاتے تھے کہ وہ ۲۴ گھنٹوں میں کیا کیا کچھ کر ڈالتی ہیں۔ جب ان سے وقت کے بارے پوچھا تو بتایا کہ جب تھوڑا وقت ملے، کتابیں پڑھنا میرا مشغلہ ہے، بس مطالعے کے دوران پنسل سے اپنے تاثرات، اصول وغیرہ ضرور نوٹ کرتی جاتی ہوں۔ لیکن تفصیلی مطالعہ اور مطالعۂ قرآن و حدیث صبح فجر کے بعد کرتی ہوں۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر تنظیمی کام، میٹنگز وغیرہ۔ کھانا پکانے کا کام تیزی سے کرنے کی مجھے عادت ہے۔ نظامتِ اعلیٰ کے دوران ہفتہ وار چھٹی کے روز ہفتے بھر کے لیے پیاز تل لیتیں، گوشت تیار کر لیتیں یا بہت سے کھانے تیار کر کے ریفریجریٹر میں محفوظ کر لیتی تھیں۔ ایک دفعہ فون پر بات ہوئی تو مزے سے حلیم کھا رہی تھیں۔ میں نے پوچھا: آپ کو نظامت کے بھاری کاموں، کلاسز کی تیاری، بچوں کے کام، پورے دن کے فونوں کے ساتھ حلیم بنانے کی فرصت کیسے ملی؟ کہنے لگیں: "یہ جو فریزر ہے نا، یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے، اس کا خوب استعمال کرتی ہوں، اور پھر یہ کارڈلیس فون اور ہیڈ سیٹ بھی اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں۔ ان کے بہت سے سیٹ رکھتی ہوں۔ گھر کے کام ہاتھوں سے جاری رہتے ہیں اور روابط ان کے ساتھ ساتھ۔

ہر روز رات میں اپنا جائزہ لیتیں، اور اگلے دن کے کاموں کی فہرست بنا لیتیں تاکہ سوچنے اور یاد کرنے میں وقت صرف نہ ہو۔ دورے اور تربیت گاہوں وغیرہ میں شرکت کے لیے سفر بھی بہت کرنا پڑتا۔ اس کے لیے بھی پورے دنوں کا کھانا تیار کر کے فریز کر کے جاتیں۔ گھر بھی ہر وقت سادہ اور صاف ستھرا رکھتی تھیں۔

عام خواتین کی طرح ہر روز سودا لانے یا بازار شاپنگ میں وقت ضائع نہ کرتی تھیں۔ پورے ہفتے کی ایک فہرست بنا کر ہفتے بھر کا سارا سامان ایک ساتھ ہی لاتیں۔ بازار کی دعا بہت پڑھتیں

اور ہم سب کو بھی یہ دعا نصاب کے ذریعے یاد کروائی تا کہ اس مادہ پرستی کے فریب سے بچ سکیں۔

گھر آنے والے مہمانوں کی تواضع بھی خوب کرتی تھیں۔ نہ جانے کیسے اس کے لیے وقت نکل آتا تھا کہ کوئی آنے والا ہو تو جھٹ سے کئی کئی کھانے تیار کرلیتیں۔ عام طور پر کوئی زیرتربیت فرد ہو تو تمام کام پہلے سے کرلیتیں، تا کہ تمام وقت اس فرد سے ضروری باتیں کرسکیں۔

● **پیکرِ خلوص:** یہ بات لکھتے ہوئے میرا دل افسردہ اور آنکھیں اَشک بار ہیں کہ فوزیہ باجی کے بارے میں ہم سب کا یہی گمان ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب سے زیادہ محبت ہم ہی سے کرتی تھیں۔ ایسی سیرت و کردار والے لوگ آج کل بہت ہی نادر و نایاب ہیں۔ اپنے تمام رشتے دار، عزیز واقارب اور تحریکی ساتھی چھوڑ کر میں جب امریکا منتقل ہوئی تو مجھے سب سے پہلے، سب سے آگے بڑھ کر محبت اور شفقت دینے والی ہستی وہی تھیں۔ میں اپنے والدین سے کہتی تھی کہ امریکا میں میری امی 'فوزیہ باجی' ہیں۔ مجھے یقین ہے سیکڑوں بہنوں کے یہی جذبات ہوں گے۔ تربیت گاہوں میں اگر رات کے تین چار بجے بھی میری روانگی ہوتو وہ میرے ساتھ جاگتی رہتیں کہ جتنا وقت ہے ساتھ گزار لیں۔ پھر زور سے گلے ملتیں اور سر پر ہاتھ رکھ کر نبیؐ کی الوداعی دعائیں پڑھتیں۔ اس طرح رخصت کرتیں کہ جیسے بیٹی کو رخصت کررہی ہوں۔

اگر کوئی فون کرے تو محبت سے بات کرنا، خلوص سے مشورے اور مسائل کا حل دینا، کتنی ہی مصروفیت ہو، ضرور وقت ملنے پر کال بیک کرنا، کم وبیش ہر دفعہ تحفے دینا___ یہ چیزیں ان کی شخصیت کا لازمی حصّہ تھیں۔ 'اکنا' کی بزرگ خواتین ان کو اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں اور نوجوان خواتین ان کی گرویدہ! نئے پرانے سبھی لوگوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

● **باعمل شخصیت:** وہ جو کہتیں وہی کرتی تھیں، قول وعمل میں تضاد نہیں تھا۔ صرف دوسروں کو نصیحت نہیں کرتی تھیں، بلکہ خود عملی مثال پیش کرتی تھیں۔ انگلش میں چیزوں کو منتقل کرنے، 'اسلام ہی کیوں؟' پراجیکٹ میں، اور حلقے کے کاموں میں دیوانہ وار آگے بڑھ کر کام کرنا شروع کیا۔ کہتی تھیں: ''مجھے کیا حق ہے کہ میں کسی کو یہ سب کام کرنے کا حکم بس سالانہ پلاننگ کے ذریعے دوں اور پہلے سے خود اس میدان میں موجود نہ ہوں۔ ایک اچھا لیڈر تو خود میدان میں پہلے اُترتا ہے اور پھر آواز لگاتا ہے کہ آؤ میرے ساتھیو، چلو میرا ساتھ دو''۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان

کے کام میں، ان کی بات میں، اس عمل کی تاثیر رکھ دی تھی۔

● **آخری لمحات**: علالت و بیماری کے ساتھ بھی بہت محنت کرتی رہیں، حتیٰ کہ 'اکنا' کی موجودہ سال کی منصوبہ بندی تک میں بھرپور انداز سے اپنے مشورے دیے۔ فروری میں ہسپتال میں داخل ہوئیں۔ کافی دن ہسپتال میں رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ کینسر پورے پیٹ میں پھیل چکا ہے اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ آخری دس بارہ روز گھر پر گزارے۔ کچھ کھا نہیں سکتی تھیں۔ ڈرپ کے ذریعے تمام غذائیت ان کو دی جارہی تھیں۔ بہت سے لوگ محبت میں ایک نظر دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔ فوزیہ باجی سب سے ملتیں، باتیں کرتیں اور جب بولنا ممکن نہ ہوتا، محبت بھری نظروں سے آنے والی بہنوں سے باتیں کرلیتیں۔

دل یہی گواہی دیتا ہے کہ ایسی نفسِ مطمئنہ ! یقیناً جنت میں جگہ پائیں گی۔ نیویارک، شکاگو، ہیوسٹن، کیلیفورنیا اور بہت سی جگہوں سے، بہت سے لوگ ملنے آئے اور سب کا یہی کہنا تھا کہ فوزیہ باجی کے آخری ایام تو ایسے تھے جیسے گل ہونے سے پہلے چراغ بھڑک اُٹھتا ہے۔ اسی طرح ایمان افروز اور دینی حرارت سے بھرپور دن تھے۔ سب کو اپنی طبیعت کے بارے میں بتانا، آیندہ کے لیے مشورے دینا، حوصلہ دینا اور یہ کہنا کہ میں تو تیار ہوں اپنے رب کے پاس جانے کو، بس مجھے جنت چاہیے، اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا، اور دین کے کاموں میں کوتاہی نہ برتنا۔ لحہ بہ لحہ موت کو سامنے آتا دیکھ کر بھی یہ حوصلہ، یہ پختگیِ عزم!

واقعی وہ ایک مثالی خاتون رہنما تھیں۔ عورت کی نیکی یا گمراہی دونوں ہی پوری قوم کے مستقبل پر اثرانداز ہوتی ہے۔ عورت ہی کی گود میں اگلی نسل کے رہنما نشوونما پاتے ہیں___ اگرچہ ۴۷ سال کی کم عمر میں اللہ تعالیٰ نے فوزیہ باجی کو (۱۳ مارچ ۲۰۰۸ء) اٹھا لیا مگر انھوں نے زندگی جس جدوجہد میں گزاری، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس کو دنیا میں پروان چڑھائیں گے اور ان شاء اللہ یہ سب ان کے لیے صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائیں، ان کو صدیقین، صالحین اور شہدا کے ساتھ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، جس تحریک میں انھوں نے اپنا حصہ ڈالا، اس کو دنیا و آخرت میں کامیابی سے نوازے۔ آمین!

کتاب نما

معتدل اسلامی فکر، مصطفیٰ محمد الطحان، مترجم: مولانا گل زادہ شیر پاؤ۔ مکتبہ المصباح، لاہور۔ صفحات: ۵۰۸۔ قیمت: درج نہیں۔

نام ورعرب محقق پروفیسر مصطفیٰ محمد الطحان کتاب الفکر الاسلامی الوسط کی اصل فکر امام حسن البنا شہید (التعالیم) کی ہے۔حسن البنا شہید 'اخوان المسلمون' کے بانی تھے اور اُمتِ مسلمہ کے لیے دلِ دردمند رکھتے تھے۔ انھوں نے اخوان المسلمون میں بیعت کے لیے ۱۰ ارکان (فہم، اخلاص، عمل، جہاد، قربانی، اطاعت، ثابت قدمی، یکسوئی، اخوت اور اعتماد) بیان کیے ہیں۔ پروفیسر الطحان نے ان ۱۰ ارکان کو شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اور ان تمام مباحث میں قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں سیرت النبیؐ اور سوانح صحابہؓ سے بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ دورِحاضر کے مسلمان اپنی زندگی کے دروبست کی درستی و اصلاح کے لیے اس کتاب سے ایک متوازن فکر اپنا سکتے ہیں۔

مولانا گل زادہ شیر پاؤ نے کتاب مذکور کا ترجمہ شُستہ اور رواں انداز میں کیا ہے، نیز جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں پاورق میں بعض ضروری امور کی وضاحت اور اضافے بھی کیے ہیں۔ اس اہم کتاب کے ترجمے سے نہ صرف اخوان المسلمون کی تحریک اور اس کے بانی کی فکر سے آگاہی ہوتی ہے، بلکہ اس نہج پر چلنے والوں کی فکری رہنمائی بھی ہوتی ہے، نیز خالص اسلامی فکر کی نمایندہ تحریکوں کے درمیان ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت اور اہمیّت و افادیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دورِحاضر کی منتشر خیالی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک متوازن اور معتدل فکر اپنانے میں یہ کتاب صحیح سمت میں رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

(محمد ایوب لِلّٰہ)

دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے معصوم شکار، ڈاکٹر ایم اے سلومی، ترجمہ: محمد یحییٰ خان۔ ناشر: نگارشات پبلشرز، ۲۴-مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: ۷۳۲۲۸۹۲۔ صفحات: ۴۱۶۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

ظلم اور مظلومیت، آفت اور بے سروسامانی، جنگ اور تباہی انسانی زندگی کے وہ کرب ناک پہلو ہیں، جن سے بظاہر فرار ممکن نہیں ہے۔ مگر ان تمام صورتوں میں متاثرین کی دست گیری اور سہارے کے لیے بعض افراد اور ادارے ایسی بے لوث خدمت انجام دیتے ہیں کہ انھیں بے ساختہ محسن کہا جاتا ہے۔ سرکاری انتظام سے ہٹ کر جو ادارے یہ کارہاے نمایاں انجام دیتے ہیں، انھیں غیرسرکاری تنظیمیں، رضاکار تنظیمیں یا نان گورمنٹل آرگنائزیشنز (NGO's) کہا جاتا ہے۔

ان این جی اوز میں سے بعض تو فی الواقع انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار، خیر النّاس من ینتفع النّاس پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن بعض این جی اوز خدمت کے نام پر ہمہ وقت عالمی سامراجی طاقتوں کے تزویراتی مفادات کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ایسی تنظیموں کو نہ صرف سامراجی چھتری میسر ہے بلکہ بے حد و حساب مالی وسائل اور دیگر سہولتیں بھی ان کے لیے مختص ہیں۔ یہ تنظیمیں مسلم دنیا میں لادینی تہذیبی یلغار کے ہراول دستوں کا کام کر رہی ہیں۔

مگر اسی جہان رنگ و بو میں دوسرا منظر یہ ہے کہ مسلمانوں کی رفاہی رضاکار تنظیموں پر مغربی اور مشرقی سامراجیوں نے نہ صرف عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، بلکہ ان کے فنڈ منجمد کرنے، ان کے رضاکاروں کو ہراساں کرنے اور انھیں قید اور جلاوطن کرنے کے ساتھ، عطیات دینے والے افراد تک کو ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں، بلکہ ان خدمت گار تنظیموں کو نام نہاد دہشت گردی کا مددگار بھی کہا جا رہا ہے۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اس گھٹیا مقصد کے لیے خود اقوام متحدہ کو آلۂ کار بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا جا رہا۔

زیرتبصرہ کتاب میں ڈاکٹر سلومی نے بڑی محنت کے ساتھ مغربی دنیا کے دہرے معیار کو بے نقاب کیا ہے اور مسلم دنیا کی رفاہی رضاکار تنظیموں کی سرگرمیوں اور ان سرگرمیوں کے خلاف مغربی ریاستی پابندیوں کے استحصال اور ظالمانہ اقدامات پر مبنی رویوں کو گہرے تحقیقی مطالعے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بوسنیا، کوسووا، افریقہ، ایشیا اور خاص طور پر فلسطین میں متحرک اسلامی رفاہی

تنظیموں کی قربانیوں اور اَن تھک جدوجہد کا بہترین ریکارڈ پیش کیا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ کس وجہ سے فاضل مصنف نے بھارتی مقبوضہ جموں و کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والوں کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ یہ اس کتاب کی ایک بڑی خامی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر مصنف کے نقطۂ نظر میں اختلاف کی گنجایش موجود ہے۔ یہ کتاب مسلم رضاکار تنظیموں پر اعتماد کو پختہ کرتی ہے اور حالات کی سنگینی کا احساس بیدار کرتی ہے، تاہم معروف صحافی محمد یحییٰ خاں نے اسے انگریزی سے اُردو کے رواں اور عام فہم قالب میں ڈھالا ہے۔ انسانی خدمت کے کسی بھی دائرے میں متحرک فرد کے لیے یہ مفید مطالعہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)

سرودِ سحر آفریں (فکروفنِ اقبال کے چند گوشے)، غلام رسول ملک۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، لاہور۔ صفحات: ۱۶۴۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

علامہ محمد اقبال فکروفن پر ۱۱ مقالات کا یہ مجموعہ اقبال اکادمی نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی 'تقدیم' کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پروفیسر ملک انگریزی زبان و ادب کے استاد اور کشمیر یونی ورسٹی سری نگر میں شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی بہت اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ Iqbal and English Romantics بھی اقبالیات پر ہے۔

زیرنظر کتاب میں اقبال کی شاعری اور فکر کا مطالعہ مختلف جہتوں اور زاویوں سے پیش کیا گیا ہے: اقبال کی عظمت کا راز، اقبال کے مذہبی افکار کی معنویت، اقبال اور ملتِ اسلامیہ کا احیاے نو اور اقبال کا قرآنی اندازِ فکر اقبال کے چند نہایت اہم موضوعات ہیں۔ بعض مضامین میں شخصیات کے حوالے سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے: اقبال اور شاہِ ہمدان، اقبال اور ورڈز ورتھ۔ بعض مضامین غزلوں اور نظموں کے تجزیے پر مشتمل ہیں (ذوق و شوق، بزم انجم، محاورہ مابین خدا و انسان)۔ دو مضامین (اقبال کے پسندیدہ اصنافِ شعر، بانگِ درا کی غزلیں) سے اقبال کے شعری فن کی بوقلمونی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصنف نقد و انتقاد میں اسلامی اور مشرقی فکروادب کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی صالح روایات کو بھی بروے کار لائے ہیں۔ ان کی آنکھ سرمۂ افرنگ کی بجاے خاکِ مدینہ سے روشن

ہے۔ مصنف نے اقبال کے ان معترضین کا مدلل اور مُسکت جواب دیا ہے جنھیں اقبال کی اسلامیت پر اعتراض ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اقبال ایک ایسا مفکر ہے جو دینِ فطرت کی بنیادوں پر عالمِ انسانیت کا ہمہ گیر ارتقا چاہتا ہے۔ متوازن اور عالمانہ افکار کا یہ مجموعہ ذخیرۂ اقبالیات میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ (حمیداللّٰہ خٹک)

Pakistan: A Proud Nation, But Failing State، اقبال ایس حسین۔ ملنے کا پتا: ۱۶-کرشن نگر، گوجرانوالہ۔ صفحات: ۳۶۶۔ قیمت: ۵۰۰ روپے/ ۲۰ ڈالر۔

پاکستان کی سلامتی کا راز انصاف کی بالادستی میں ہے، یہی رب تعالیٰ کا حکم ہے اور یہی پاکستانی قوم کی اُمنگ ہے۔ زیرنظر کتاب میں اقبال ایس حسین نے حالیہ برسوں میں درپیش اُن چیلنجوں کا جائزہ لیا ہے جن کی بدولت پوری قوم ذہنی اضطراب میں مبتلا ہوچکی ہے اور آزمایشوں کا ایک سلسلہ ہے جو مسلسل منظرعام پر آتا رہتا ہے۔

اگرچہ مصنف کی نصف درجن سے زائد کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں اور پاکستان و بیرون پاکستان میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں، تاہم زیرتبصرہ کتاب میں خالصتاً پاکستان، پاکستانی عوام، لال مسجد، سپریم کورٹ، عوامی سیاست، مذہبی جکڑبندی اور حکمرانوں کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حکمرانوں کو ان اقدامات کے نقصان کا صحیح اندازہ نہیں ہے، ورنہ وہ سپریم کورٹ کے ججوں، عدالتوں کے وکلا، قبائلی علاقوں کے زُعما اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو یک قلم منظر سے ہٹانے کی جسارت نہ کرتے۔

جنرل ایوب خان کے خلافِ آئین اقدامات کا جائزہ لینے کے بعد جنرل پرویز مشرف کے غیرقانونی اقدامات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اگر صدر پاکستان نے امریکی اشارے پر اپنے ہی عوام پر گولیاں نہ برسائی ہوتیں اور سپریم کورٹ کے ججوں کے ساتھ، پنجہ آزمائی نہ کی ہوتی تو اُس خلفشار سے بچ سکتے، جس نے اُنھیں عوام الناس میں یکسر غیرمقبول بنا دیا۔

اس کتاب کا ایک خاص پہلو قانون دانوں اور طبقۂ وکلا سے متعلق ہے، جس میں انتہائی جان دار انداز میں وکلا کی تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُن قانونی نکات کی وضاحت کی گئی ہے جو

شہریوں کو، عدالتوں کو اور ججوں کو بھی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ مصنف کا موقف ہے کہ اخلاقی گراوٹ کا سب سے بڑا مظاہرہ ججوں کو برطرف کر کے کیا گیا، اس کتاب کے کئی نکات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، تاہم مجموعی طور پر پاکستانی سیاست کے پیچ وخم سمجھنے میں اس سے غیر معمولی مدد لی جاسکتی ہے۔ (محمد ایوب منیر)

مغربی فلسفۂ تعلیم ، ایک تنقیدی مطالعہ ، سید محمد سلیم۔ ناشر: زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، اے-۴/۱۷، ناظم آباد نمبر۴، کراچی ۷۴۶۰۰۔ فون: ۶۶۸۴۷۹۰-۰۲۱۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

پروفیسر سید محمد سلیم (۱۹۲۳ء-۲۰۰۰ء) اپنی ذات میں ایک جہانِ علم ودانش تھے۔ ان کی حیات ہمہ پہلو کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کی زندگی تعلیم و تعلم کے میدان میں گزری۔ تعلیم پر انھوں نے بڑا وقیع تحریری سرمایہ چھوڑا ہے جس میں زیرتبصرہ کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کا اُردو میں کوئی ثانی نہیں۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مغربی فلسفۂ تعلیم کا عمیق مطالعہ اور اس کے اثرات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یورپ کا کلیسائی معاشرہ، مسلکِ لادینیت کا آغاز، لادینی نظریات کی فتوحات، لادینیت کا فکری نظام، لادینی نظریات میں تزلزل، لادینی تحریک تعلیم گاہ میں، مغربی نظام تعلیم کی اقدار مقاصدِ تعلیم اور دورِ جدید اسلام کی برکت ہے۔ پاکستان کے بے ثمر تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ اڈیشن پروفیسر سید محمد سلیم اکیڈمی کے زیراہتمام شائع کیا گیا ہے۔ (ملک نواز احمد اعوان)

Granny Nam Tells Me Story، نصرت محمود۔ ناشر: ۱۹۱-جے، ڈی ایچ اے، ای ایم ای سیکٹر، ایسٹ کینال بنک، لاہور۔ صفحات، اول: ۴۰، دوم: ۴۳، سوم: ۳۵۔ قیمت: درج نہیں۔

کہانیاں معصوم ذہنوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ والدین، دادی اور نانی سے سنی ہوئی کہانیاں ذہن پر گہرا نقش چھوڑتی ہیں۔ اسکول کے ابتدائی برسوں میں بچہ سب سے زیادہ کہانیوں پر توجہ دیتا ہے۔ مسلم گھرانوں میں اس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے کہ شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیاں بھی اخلاقی پیغام رکھتی ہوں۔

محترمہ نصرت محمود نے آسان انگریزی میں ابتدائی جماعتوں کے بچوں کے لیے مختصر کہانیاں تحریر کی ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن جانوروں کا ذکر آیا ہے، اُن کے حوالے سے کہانی تشکیل پاتی ہے۔ اخی اور سارہ نامی بچے ان سے ملتے ہیں۔ وہ جانور، اپنے الفاظ میں اپنی کہانی سناتے ہیں اور یہ کہانی کسی نبیؑ کی زندگی کے حالات سے جڑ جاتی ہے۔ مچھلی اپنی کہانی سناتی ہے تو اسی دوران میں حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ تفصیلاً بیان کردیا جاتا ہے۔ مصنفہ نے کوشش کی ہے کہ قرآنی تفصیلات تک ہی محدود رہیں، مثلاً داوٗد علیہ السلام کے بارے میں عہد نامۂ قدیم و جدید میں جو تفصیلات ملتی ہیں، اُن کو کہانی میں شامل نہیں کیا گیا۔

تین حصوں پر مشتمل اس سیریز کے ذریعے ۳۰ جانوروں اور حشرات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے گویا دادی اماں، چھوٹے بچوں کو کہانی سنا رہی ہوں۔ طباعت کا معیار عمدہ ہے اور حسبِ موقع جانوروں کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے یہ انگریزی باتصویر کہانیاں ایک خوب صورت تحفہ ہیں۔ (م - ا - م)

سنہری کرنیں، عبدالمالک مجاہد، ناشر: دارالسلام، ۳۶- لوئر مال، لاہور- فون: ۷۲۴۰۰۲۴۔ صفحات (آرٹ پیپر): ۳۹۰۔ قیمت: ۴۰۰ روپے

مغرب نے ہماری تہذیب کے قلعے، ہمارے گھر پر نقب لگائی بالخصوص خواتین کو اسلام سے بدظن کرنا ہدف بنایا مگر عجب اتفاق ہے کہ آج مغرب میں قبولیت اسلام کا زیادہ رجحان خواتین میں پایا جاتا ہے، اور ہمارے ہاں بھی خواتین اسلام میں جذبۂ اسلام کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ خواتین میں تعلیماتِ اسلام کو عام کرنے کے لیے عام فہم، دل چسپ اور ایمان افروز لٹریچر تیار کیا جائے۔ اشاعت کی دنیا میں دارالسلام آج ایک معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیرتبصرہ کتاب ادارے کی ایسی ہی ایک کاوش ہے۔ مسلم خواتین کے بارے میں احادیث اور تاریخ و سیر میں آئے واقعات، نیز آج کل کے ایمان افروز واقعات کو، جن میں خواتین کی پرہیزگاری، ذہانت اور بہادری ظاہر ہوتی ہے، جمع کر کے دل کش پیرایے میں فراہم کیا گیا ہے۔ کُل ۱۰۲ واقعات ہیں۔ مطالعہ کرنے والے کو کچھ عربی بھی آتی ہو تو وہ صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوگا۔ واقعات کی پیش کش

میں موضوعاتی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ طباعت کا اعلیٰ معیار، ہر صفحہ آرٹ پیپر، ہر صفحہ رنگین پھول دار حاشیوں سے مرصع، یہ کتاب ۴۰۰ روپے میں بھی سستی لگتی ہے۔ سنہرے اوراق کے بعد سنہری کرنیں، امید ہے کہ یہ سنہری سلسلہ جاری رہے گا۔ (مسلم سجاد)

تعارف کتب

◉ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، شخصیت اور فن۔ ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، ایچ-۸، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۶۴۔ قیمت مجلد: ۱۶۵ روپے، پیپربیک: ۱۵۵ روپے۔ [علمی و ادبی شخصیات کے تعارفی سلسلے کی ایک کتاب۔ نام ور محقق اور اسکالر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے سوانح، شخصیت کے اوصاف۔ اُردو، عربی، فارسی اور سندھی زبانوں سے متعلق ان کے وسیع الاطراف علمی کام کا تعارف۔ مصنف نے ایک وسیع موضوع کو عمدگی سے سمیٹا ہے۔]

◉ انٹیلی جنس اور اسلام، ملک عطا محمد۔ ناشر: ۸۵-رحمت پارک، یونی ورسٹی روڈ، سرگودھا۔ صفحات: ۱۲۴۔ قیمت: ۶۰ روپے۔ [انٹیلی جنس کے موضوع پر اُردو زبان میں بہت کم مواد کتابی صورت میں دستیاب ہے۔ اگرچہ دنیا کی بعض اہم خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں بعض کتب کے اُردو تراجم دستیاب ہیں، مگر ان سب میں اسلام کے حوالے سے تذکرہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے زیرنظر کتاب عمدہ کاوش ہے۔ انٹیلی جنس اور جاسوسی پر قریباً ایک سو عنوانات کے ذریعے عام فہم انداز میں قرآن و حدیث سے استدلال کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ کتابیات سے کتاب کی وقعت میں اضافے کے ساتھ اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے رہنمائی بھی ملتی ہے۔]

◉ جادو اور مذہب، ترجمہ: ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی۔ ناشر: مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۴۷، قیمت: ۳۰۰ روپے۔ [زمانہ قبل از تاریخ کے مختلف ادوار سے مابعد کے ادوار تک جادو اور مذہبی عقائد کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اقتدار کے حصول اور اسے قائم رکھنے کے لیے بادشاہ کیا کچھ کرتے رہے۔ جادوٹونے کے اثرات، جادوگروں اور مذہبی اجارہ داروں کی کارستانیاں اور مختلف اقوام کی عجیب وغریب رسوم ورواج کا تذکرہ ہے۔ مغرب کے انسان کے اعتقادات اور تہذیب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ افریقی ممالک کی رسوم کا ذکر ملتا ہے۔ انگریزی سے ترجمہ ہے لیکن مصنف اور کتاب کے اصل نام کا پتا نہیں چلتا۔]

◉ والدین کی قدر کیجیے، محمد حنیف عبدالمجید۔ ناشر: دارالہدیٰ، دفتر نمبر ۸، پہلی منزل، شاہ زیب ٹیرس، اُردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۵۱۹، قیمت: درج نہیں۔ [مادیت ہماری معاشرتی اقدار کو بتدریج متاثر کر رہی ہے۔ بوڑھے والدین اب بوجھ سمجھے جانے لگے ہیں۔ اس کتاب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں والدین کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ۱۰۰ سے زائد واقعات بھی درج ہیں جو والدین کی خدمت کرنے اور اخلاق وعمل کے لیے محرک کا کام کرتے ہیں۔ آیات، احادیث اور دعاؤں کے علاوہ اقوال اور ضرب الامثال کا عربی متن اور ترجمہ بھی درج ہے۔ اختصار سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔]

مدیر کے نام

حمیداللہ خٹک 'کرک

پرویز مشرف نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر محب وطن نہتے عوام کا خون بہایا اور فوج اور عوام کو آپس میں لڑا کر نفرت کی دیواریں کھڑی کیں، اور اس ذلت آمیز غلامی پر ندامت کے بجاے ببانگ دہل کہا کہ "امریکا ہماری خدمات کا معاوضہ ادا کرتا ہے"۔ گویا پاکستان اور اس کی فوج بھاڑے کے ٹٹو ہیں کہ جو چاہے پیسے دے کر اس سے اپنے کام کرا لے۔ یہ معاوضہ بھی کیا ہے؟ دی پوسٹ (۲ مارچ ۲۰۰۸ء) کے مطابق: امریکی کانگرس کمیٹی کے سامنے جو اعداد و شمار آئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ پاکستانی فوج کے ہر سپاہی پر جو اس نام نہاد جنگ میں استعمال ہو رہا ہے، ۶۵۰ ڈالر ماہانہ خرچ آرہا ہے، جب کہ امریکا اپنے ہر فوجی پر افغانستان میں ۸۰ ہزار ڈالر اور عراق میں ایک لاکھ ڈالر فی سپاہی خرچ کر رہا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں: ؏ قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند۔ کیا ایسے لوگ قابلِ مواخذہ نہیں؟

صابر حسین 'ہری پور

'توہین آمیز خاکوں کی مکرر اشاعت' (اپریل ۲۰۰۸ء) کے حوالے سے عرض ہے کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ممکنہ عملی اقدامات اٹھائے جائیں۔ ڈنمارک کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی بات کی گئی ہے، مناسب ہوگا کہ ان کی مصنوعات کی فہرست جاری کی جائے تاکہ بھرپور بائیکاٹ کیا جاسکے۔ ایک مؤثر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ڈنمارک کے سفارت خانے کو اتنے خطوط لکھے جائیں کہ ان کے سفارت کار اپنی حکومت کو توجہ دلانے پر مجبور ہو جائیں۔ ایک احتجاجی خط/ ای میل/ ایس ایم ایس تو ہر محبِ رسولؐ ضرور بھیج سکتا ہے۔

بلال احمد 'کوئٹہ

'اسلام کی روشنی تک!' (اپریل ۲۰۰۸ء) سے یہ احساس تازہ ہوا کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس پر کیا چیز اثر کرے اور وہ ہدایت کی روشنی میں آجائے۔ محمد سعید قلیوں کو نماز باجماعت پڑھتے دیکھ کر اسلام کی طرف آگئے۔ صاحبِ علم اور دانش ور تھے اس لیے اسلام کی اتنی خدمت کی اور اتنے مبلّغ تیار کیے۔ ساری دنیا میں ہر طرف قبولِ اسلام کی ایک لہر ہے۔ اس کا سائنسی مطالعہ ہونا چاہیے۔

ظہیر احمد 'کراچی

'اسلام اینڈ سیکولر مائنڈ' (اپریل ۲۰۰۸ء) پر لکھتے ہوئے تبصرہ نگار نے مولانا مودودی علیہ الرحمہ کے ساتھ مغرب کا مطالعہ کرنے والے جن افراد کے سلسلۃ الذھب کا ذکر کیا ہے، یعنی عبدالحمید صدیقی، خرم مراد اور پروفیسر خورشید احمد، اس میں غالباً ایک نام سہواً رہ گیا ہے، یعنی نعیم صدیقی۔

اسلام آباد موٹر وے چکری انٹرچینج سے متصل

قرطبہ کارپوریشن کا عظیم الشان رہائشی منصوبہ

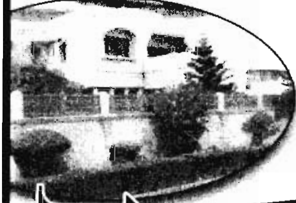
تعلیم یافتہ باشعور افراد کی بہترین بستی

دار السلام

دار السلام

پہلے سب کو دیکھیں پھر ہم سے خریدیں

قرطبہ سٹی کے قریب واقع تقریباً 30 سوسائیٹیوں میں سب سے پہلے 120 فٹ ڈبل سڑک سید مودودی چوک پر واقع



محفوظ سرمایہ کاری

قرطبہ کارپوریشن

آپ کے اپنے افراد کا قابل اعتماد ادارہ



یقینی منافع

محل وقوع

- مین ڈبل روڈ پر "سید مودودیؒ چوک" سے متصل۔
- چکری انٹرچینج اور مین چکری سٹاپ سے نزدیک ترین۔
- چکری کے مضافات کی تقریباً 30 سوسائیٹیوں میں آئیڈیل لوکیشن
- اعلیٰ تعلیمی اداروں اور جدید سرکاری ہسپتال سے قریب۔
- مجوزہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے قریب۔

خصوصیات

- پُر فضا مقام پُر سکون ماحول اور خوبصورت محل وقوع
- مجوزہ چکری انڈسٹریل اسٹیٹ میں روزگار کے مواقع
- اعلیٰ تعلیمی اداروں، ہسپتالوں اور کاروباری مراکز تک دسترس
- زرخیز اور ہموار سطح اراضی
- جدید سہولتوں سے آراستہ اور ... ریٹ سب سے کم۔

300 روپے ماہانہ فی مرلہ قسط

آسان طریقہ ادائیگی

سائز	کل قیمت	ایڈوانس	ماہانہ قسط
5 مرلے	250,000	25,000	1500
10 مرلے	500,000	50,000	3000
1 کنال	1000,000	100,000	6000

اکاؤنٹ نمبر بنام قرطبہ کارپوریشن **79000026-3**

حبیب بینک رحمان آباد برانچ، مری روڈ راولپنڈی

ہمارے تکمیل شدہ منصوبے

دارالسلام (فیز-I) موٹروے چوک اسلام آباد

دارالسلام نی پور روڈ واہ کینٹ

قرطبہ ٹاؤن (فیز-I) چارسدہ روڈ پشاور

پشاور شہر سے متصل سب سے سستی سکیم متعارف کرانے کا اعزاز بھی قرطبہ کارپوریشن کو حاصل ہے۔ قرطبہ ٹاؤن ریکارڈ مدت دسمبر 2006 میں ایک فیز مکمل بک ہو چکا ہے جبکہ قرطبہ ٹاؤن فیز-II کی بکنگ جاری ہے۔



محفوظ مستقبل

پلاٹ سائز

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ اور ایک کنال **کمرشل پلاٹ** فی یونٹ 2 مرلہ، قیمت 3 لاکھ روپے

USA

UMAR UMAR ABDUL
824 E9, ST # 6G, BROOKLYN NY
917-821-6149, 817-434-4456
islamedu-mediccom@yahoo.com

قرطبہ کارپوریشن

راولپنڈی آفس

محمد یونس صدیقی (مینیجنگ ڈائریکٹر)

B/1-12 سیکنڈ فلور تاج محل پلازہ متصل ... روڈ چوک مری روڈ راولپنڈی

فون: 051-4450320 موبائل 0321-5076010

پشاور آفس

صبیح الرحمٰن یوسفی (ڈائریکٹر)

سیکنڈ فلور حسین کمپلیکس بالمقابل جناح پارک (نزد فردوس سٹاپ) پشاور

موبائل 0321-5240933/0300-5988039

کراچی آفس

مولانا سلطان سید (ایریا مینیجر کراچی)

پلاٹ نمبر: N-629/30 شاہ لطیف ٹاؤن قاسم ... کراچی

موبائل: 0321-2300169 فون 021-4102066

قاضی گروپ آف کمپنیز

تعارف:۔

قاضی گروپ آف کمپنیز کی تاریخ گذشتہ بیس برسوں پر محیط ہے۔ گروپ کے چیئر مین **شوکت محمود قاضی** نے سال 1988 میں پراپرٹی اور رئیل اسٹیٹ کے شعبہ میں قاضی انٹرپرائز ز کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا۔ شبانہ روز کی انتھک محنت جہد مسلسل مستقل مزاجی، دیانتداری وجذبہ اخلاص کے نتیجہ اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے کاروباری دنیا میں اب یہ ایک مستحکم اور قابل اعتماد ادارہ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ قاضی انٹرپرائز ز کو الحمدللہ اب تک کئی رہائشی منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ جہاں ممبران رہائش پذیر ہیں یا اپنے مکان/فلیٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع کما چکے ہیں۔ قاضی انٹرپرائز ز کے مکمل اور آباد ہونے والے منصوبہ جات میں **الرحمٰن ٹاؤن، پاسبان ٹاؤن، گلستان راشد اور فیملی اپارٹمنٹس مری** ہیں۔ جبکہ زیرتعمیر منصوبوں میں **کوہسار سٹی مری موٹروے سٹی، شفاء گارڈن اسلام آباد، قطبال ٹاؤن اسلام آباد، حمیدہ ٹیرس اور اسلام آباد ہل گارڈن** شامل ہیں۔ **قاضی گروپ آف کمپنیز** کے تحت دیگر اداروں میں **قاضی کنسٹرکشن کمپنی، ایچ ایس ٹریڈنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، قاضی ہاؤسنگ پرائیویٹ لمیٹڈ پندرہ روزہ تجارتی مجلہ مستقبل** اور **فلاحی ادارہ حق ٹرسٹ** شامل ہیں۔

حق ٹرسٹ

حق ٹرسٹ کے تحت مستحقین کی فلاح و بہبود، یتیم بچیوں کی شادی، غریب طلبا کی تعلیم، دینی مدارس کی خدمات، غریب مریضوں کے علاج، چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے بلا سود قرض وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات مثلاً زلزلہ اور سیلاب وغیرہ میں متاثرین کی امداد وغیرہ بھی کی جاتی ہے۔

پندرہ روزہ مستقبل میگزین:

یہ معاشی اور کاروباری نوعیت کا **ایک منفرد** میگزین ہے جو پاکستانی نوجوانوں کو پاکستان میں رہ کر کم سرمایہ سے اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ملک کی معاشی اور تجارتی صورتحال سے قارئین کو باخبر رکھتا ہے۔

ایچ ایس ٹریڈنگ پرائیویٹ لمیٹڈ:

یہ ادارہ موٹر سائیکل اور ہر قسم کے الیکٹرانکس کے سامان کی فروخت نقد اور آسان اقساط پر کرتا ہے۔ اس شعبہ میں جو مختلف ذیلی ادارے اور برانچیں کام کر رہی ہیں ان میں ایچ ایس ٹریڈرز راولپنڈی و اسلام آباد، **HS** ٹریڈرز میانوالی، **HS** ٹریڈرز دولتالہ، فرینڈز الیکٹرانکس چکوال، قاضی مارکیٹنگ مظفر آباد شامل ہیں۔

موٹروے سٹی

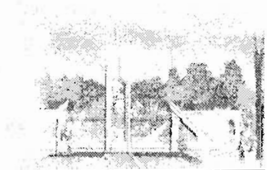
حکومت سے منظور شدہ واحد منصوبہ
NOC-91N-1/TP/TMA/FJ



مسجد جو تیار ہو چکی ہے

محل وقوع: یہ منصوبہ سرسبز پہاڑوں کی وادی، قدرتی لینڈ سکیپ سے بھرپور، تنازہ ڈیم اور شاہ پور ڈیم جیسے خوبصورت پکنک سپاٹس اور تعمیر ملت ایجوکیشن سٹی سے ملحق، زیر تکمیل نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ اور پشاور لاہور موٹروے کے وسط میں واقع ہے۔

ترقیاتی کام: جن فیزوں کی بکنگ مکمل ہو چکی ہے ان میں ترقیاتی کام جاری ہیں۔ پانی کی خوبصورت جھیلیں، مسجد، مین باؤنڈری وال، مین گیٹ اور ارتھ ورک مکمل ہو چکا ہے۔ سڑکوں کا کام جاری ہے۔



گیٹ جو بن چکا ہے

قیمت و طریقہ ادائیگی:

موٹروے سٹی (محدود مدت تک رعایتی قیمت)

سائز	ڈسکاؤنٹ	قیمت زمین	ایڈوانس	ماہانہ قسط
5 مرلے	20 فیصد	250000/-	25000/-	1500/-
10 مرلے	20 فیصد	500000/-	45000/-	3500/-
20 مرلے	20 فیصد	1000000/-	65000/-	6000/-

(اس کے علاوہ -/200 روپے فی مرلہ ممبرشپ فیس وصول کی جائے گی)

بنیادی سہولیات و خصوصیات: کشادہ سڑکیں، محفوظ داخلی راستے، نکاسی آب/سیوریج، پانی جیسی نعمت کی فراوانی، ہر فیز میں شاپنگ سینٹر اور مسجد۔

قطبال ٹاؤن اسلام آباد

(بکنگ جاری ہے)

پہلے قبضہ پھر قیمت

یہاں ترقیاتی کام مکمل ہو چکے ہیں اور گھروں کی تعمیر جاری ہے

محل وقوع: اسلام آباد ہائی وے کے قریب کھنہ ایسٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد ہائی وے کے قریب زیرو پوائنٹ سے صرف چند منٹ اور اسلام آباد ایئرپورٹ سے چند منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔

آپ ابھی پلاٹ خریدیں اور فوری گھر بنائیں

پلاٹ سائز: 1250 مربع فٹ، 1500 مربع فٹ، 1750 مربع فٹ
قیمت: 250,000/- روپے فی مرلہ

خصوصیات: یہ منصوبہ جدید سہولیات سے آراستہ ہے جہاں صاف ستھرا آلودگی سے پاک ماحول ہے۔

ایڈریس ہیڈ آفس: **قاضی انٹرپرائزز**

8 جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی
U.A.N:111-700-400 فیکس: 051-5962230
ای میل Email: shaukat@isb.comsats.net.pk
ویب سائٹ www.qazi.com.pk

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

قرطبہ سٹی

امن اور علم کی بستی اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم و تحقیق

Madina Tul Ilm



محلِ وقوع و آب وہوا:

قرطبہ سٹی کے لئے جگہ کا انتخاب چکری انٹرچینج ،موٹروے (M2) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ جگہ اسلام آباد، راولپنڈی سے 30 منٹ کی ڈرائیو (50 کلومیٹر تقریباً) پر تحصیل راولپنڈی میں واقع ہے۔ کوہ خیری مورت کے دامن میں واقع یہ علاقہ قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ اس کا موسم اور نشیب وفراز اسلام آباد سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے درمیان سے دریائے سِل بل کھاتا ہوا گزرتا ہے جس میں قدرتی چشموں کی وجہ سے سارا سال پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔

شہری سہولیات وخصوصیات:

❀ تمام سہولیات جو ایک جدید شہر میں ہوتی ہیں ❀ شجرکاری اور اس کی مستقل دیکھ بھال گھروں کے معیاری نقشہ جات کی فراہمی۔

❀ قرطبہ سٹی کا اندرونی ٹرانسپورٹ کا نظام ❀ قرطبہ سٹی سے اسلام آباد، راولپنڈی تک ٹرانسپورٹ کی سہولت ❀ منصوبے کو آباد کاری کے دوران مالی لحاظ سے خود کفیل رکھنے کا نظام۔

❀ اسلامی معاشرتی اقدار کے فروغ کے لئے شہری زندگی اور ہمسائیگی کے خصوصی بائی لاز ❀ تمام شہری سہولیات کی فراہمی اور مستقل دیکھ بھال کا نظام۔

منصوبے کی خصوصیات:



❀ قرطبہ سٹی کے وسط میں وسیع وعریض بین الاقوامی قرطبہ یونیورسٹی کا قیام وانصرام۔ یہ یونیورسٹی جدید سائنسی اور معاشرتی علوم پر تحقیق اور اُن کو اسلامی قدروں میں ڈھالنے کا محور ہوگی۔ ❀ ایک عظیم الشان مرکزی جامع مسجد قرطبہ کا قیام وانصرام۔ یہ جامع مسجد یونیورسٹی سے ملحقہ ہوگی اور یونیورسٹی کے مقاصد کے حصول میں کلیدی کردار کی حامل ہوگی۔ ❀ خواتین کے لیئے خصوصی کاروباری مراکز وتفریحی مقامات۔

ترقیاتی کاموں کی صورتِ حال اور ماسٹر پلان:

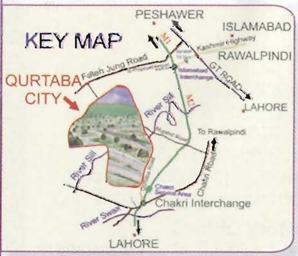
❀ اس عظیم الشان منصوبے کے لیے 4 سے زائد ملحقہ موضع جات میں زمین کی خرید کی جاچکی ہے۔ ان میں سے ایک موضع کی زمین کو یکجا کیا جا چکا ہے (الحمدُ اللہ)۔ اور بقیہ موضع جات میں یکجا کرنے کا عمل جاری ہے۔ منصوبے کے حجم کے پیشِ نظر اس کی منصوبہ بندی اور تکنیکی کام مُلک کے مشہور اور مایہ ناز تکنیکی منصوبہ ساز اور کنسلٹنٹ میسرز نیسپاک (نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان) کو سونپا گیا ہے۔ نیسپاک نے ایک جامع شہری منصوبہ پیش کر دیا ہے۔ اور یکجا ہونے والے وسیع رقبہ کی منصوبہ بندی مکمل کر دی ہے۔ انجینئرز کا تیار کردہ ماسٹر پلان TMA کے پاس منظوری کے لیئے جمع کروا دیا گیا ہے۔ اور تکنیکی مرحلوں سے گزر کر اب یہ ماسٹر پلان منظوری کے آخری مرحلہ میں ہے۔



قرطبہ سٹی پراجیکٹ آفس کا ایک منظر

پراجیکٹ آفس اور سائیٹ کا مشاہدہ:

❀ عظیم الشان منصوبے کی ضرورت کے مطابق تمام جدید سہولیات سے مزین پراجیکٹ آفس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اور جلد ہی انجینئرز اس آفس میں تعمیراتی کاموں کی نگرانی کا آغاز کر دیں گے۔ آپ سائیٹ کے مشاہدہ کے لیے چکری انٹرچینج موٹروے (M2) سے نکل کر اشارتی بورڈز کے مطابق پراجیکٹ آفس کا دورہ کر سکتے ہیں۔



پلاٹ بکنگ:

❀ ٹاؤن پلاننگ کی منظوری کے ساتھ ہی مزید پلاٹ بکنگ کے لئے پیش کر دیے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی الاٹمنٹ کا طریقہ کار اور نئی قیمتوں کا تعین بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ پلاٹ ہولڈرز متوجہ ہوں:

❀ قرطبہ سٹی کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا ڈاک کا پتہ درست کروائیں تا کہ ڈاک کی ترسیل یقینی بنائی جا سکے۔ ایڈریس تبدیل کرنے کے لئے فارم دفتر سے حاصل کریں۔ اقساط پر بکنگ کرواتے والے حضرات فوری طور پر اپنی بقایا اقساط جدول کے مطابق ادا کر دیں۔ بقایا جات جاننے کے لئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔ خواتین وحضرات اپنی رائے اور تجاویز سے مدینۃ العلم کے پتہ پر یا Email کے ذریعہ آگاہ کریں۔

مدینۃ العلم

فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد

فون: 92-51-2206380 فیکس: 92-51-2270411

info@qurtabacity.com

Rev. 4.0

L.R.L 99 *Monthly* TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE. Ph: 7587916
Fax: 7585590